مرتبین: سجاد اظہر، احمد اعجاز

سماجی ہم آہنگی، رواداری اور تعلیم

پاکستان کی جامعات کے اساتذہ کے ساتھ نشستوں کی روداد

PAK INSTITUTE FOR PEACE STUDIES (PIPS)

سماجی ہم آہنگی، رواداری اور تعلیم

پاکستان کی جامعات کے اساتذہ کے ساتھ نشستوں کی روداد

مرتبین: سجاد اظہر، احمد اعجاز

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

PAK INSTITUTE FOR PEACE STUDIES

KNOWLEDGE FOR PEACE

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	سماجی ہم آہنگی، رواداری اور تعلیم پاکستان کی جامعات کے اساتذہ کے ساتھ نشستوں کی روداد
مرتبین	:	سجاد اظہر، احمد اعجاز
اشاعت	:	جولائی 2016ء
تزئین	:	زی گرافکس
قیمت	:	100 روپے
تعداد	:	ایک ہزار
صفحات	:	198
مطبع	:	بی پی ایچ پرنٹرز

ISBN: 978-969-9370-25-0

برائے رابطہ

پوسٹ بکس نمبر 2110، اسلام آباد

فون: 051-8359475

ای میل: pips@pakpips.com

ویب سائٹ: www.pakpips.com

فہرست

پیش لفظ 05

کراچی میں ہونے والی دوروزہ تربیتی ورکشاپ کی روداد 07

(برائے صوبہ بلوچستان اور سندھ)

مری میں ہونے والی دوروزہ تربیتی ورکشاپ کی روداد 74

(برائے صوبہ سرحد، فاٹا اور گلگت بلتستان)

مری میں ہونے والی دوروزہ تربیتی ورکشاپ کی روداد 133

(برائے صوبہ پنجاب اور آزاد کشمیر)

معلمین کا تعارف 195

پیش لفظ

سماجی ہم آہنگی کیا ہے؟ اوراس کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ یہ سوال سماجی ثقافتی، مذہبی اور لسانی اعتبار سے متنوع معاشروں میں بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔تنوع بذاتِ خود ایک مثبت اظہار ہے،لیکن جب اکثریت احساس برتری کا شکار ہو جائے تو سماجی تنوع کو نقصان پہنچتا ہے۔منفی قدریں اور رویئے نشو نما پانے لگتے ہیں۔تنوع ایک نازک اور حساس اصطلاح ہے اور بطور سماجی قدر اسے مثبت اور بطور تخلیقی اظہار ایک مظہر کے برقرار رکھنے کے لئے ایک طویل ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ ریاضت سماج کے تمام طبقوں کو کرنا پڑتی ہے۔خاص طور پر وہ اکثریتی طبقات جو سیاسی، مذہبی اور سماجی مفادات کے نگہبان تصور ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ذہن سازی اور رائے سازی کے عمل میں بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ان طبقات کو اپنے اجتماعی اور گروہی مفادات کو دیگر اقلیتی طبقات کے مفادات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے۔

اساتذہ کرام نئی نسلوں کی ذہن سازی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی عمل میں انہیں سماجی، مذہبی اور ثقافتی طور پر متنوع طلباء کے ساتھ ربط بھی رکھنا پڑتا ہے۔کلاس روم میں ان کے رویئے نہ صرف اکثریتی طلباء کے اظہار کو مضبوط کرتے ہیں بلکہ دیگر طبقات کے طلباء میں احساس برابری یا کمتری کا شعور بھی پختہ کرتے ہیں۔تدریسی عمل ایک حساس عمل ہے جو اساتذہ کے مرہونِ منت ہوتا ہے۔خاص طور پر مذہبی امور پر ان کا رویہ اور نصاب کو پڑھانے کا طریقہ سماجی اور مذہبی ہم آہنگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔اس تناظر میں پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز نے پاکستان بھر کی جامعات اور پوسٹ گریجویٹ کالجز کے شعبہ اسلامیات اور عربی کے اساتذہ کے ساتھ مکالمے اور مشاورت کا اہتمام کیا جس میں نہ صرف معاملے کی

حساسیت سامنے آئی بلکہ سماجی ہم آہنگی میں اساتذہ کے کردار کے بارے میں تجاویز بھی سامنے آئیں۔یہ رپورٹ انہی مکالموں کی روداد پر مشتمل ہے اور آپ کی رائے ان مکالموں کو مزید بہتر بنانے میں ہمارے لئے معاون ثابت ہوگی۔

محمد عامر رانا

28-27 اپریل کو کراچی میں ہونے والی
دو روزہ تربیتی ورکشاپ کی روداد

نشست اوّل: تعارف، پس منظر اور لائحہ عمل

صدارت: ڈاکٹر قبلہ ایاز (سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی)

استقبالیہ کلمات: محمد عامر رانا (ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز

دوسری نشست: مسائل کی نشاندہی اور تجاویز

تیسری نشست: گروپ رپورٹس اور ان پر بحث

صدارت: خورشید ندیم (محقق، دانشور و کالم نگار)

چوتھی نشست

صدارت: خورشید ندیم (محقق، دانشور و کالم نگار)

مقررین: پاکستان کا سماجی اور سیاسی منظر نامہ اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا کردار
ڈاکٹر سید جعفر احمد (ڈائریکٹر پاکستان سٹڈی سینٹر جامعہ کراچی)
پاکستان میں مذہبی و مسلکی تنوع اور مذہبی اداروں کا کردار
ڈاکٹر عبدالحمید نیئر (سابق پروفیسر، قائداعظم یونیورسٹی)

دوسرا دن

پہلی نشست: عدم برداشت اور شدت پسندی

صدارت: ڈاکٹر خالدہ غوث: سابق ڈائریکٹر سینٹر آف ایکسیلینس فار ویمن، چیئرپرسن
پاکستان سینٹر فار
ڈیموکریسی اسٹڈیز کراچی یونیورسٹی)

مقررین: ڈاکٹر قبلہ ایاز (سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی)
محمد عامر رانا (ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز)

سوالات و جوابات

دوسری نشست: مذہبی عدم رواداری اور عمومی رویوں کا بگاڑ

صدارت: ڈاکٹر عبدالحمید نیئر (سابق پروفیسر، قائداعظم یونیورسٹی)

مقررین: رومانہ بشیر (سماجی کارکن و ایگزیکٹو ڈائریکٹر پیس اینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن)
وسعت اللہ خان (صحافی، کالم نگار و اینکر پرسن)

آخری نشست: گروپ رپورٹس

صدارت :ڈاکٹر عبدالحمید نیئر (سابق پروفیسر، قائداعظم یونیورسٹی)

......o......

شرکاء

۱۔ ڈاکٹر سید باچا آغا: اسسٹنٹ پروفیسر ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ

۲۔ ڈاکٹر عبدالعلی اچکزئی: چیئرمین اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ، بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ

۳۔ پروفیسر گل محمد: لیکچرار اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ، بلوچستان یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی خضدار

۴۔ مفتی محمد رفیق: لیکچرار اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ انٹر کالج کوئٹہ

۵۔ ڈکٹر معروف بن رؤف: پروفیسر اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی آف لورالائی

۶۔ ڈکٹر سنبل انصار: چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف بیسک سائنسز سندھ مدرستہ السلام

۷۔ ڈاکٹر زاہد علی: ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک لرننگ، کراچی یونیورسٹی

۸۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن یوسف: شعبہ عربی، کراچی یونیورسٹی

۹۔ ڈاکٹر عبدالحئی مدنی: اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ این ای ڈی یونیورسٹی کراچی

۰۱۔ ڈاکٹر گلناز نعیم: اسٹنٹ پروفیسر اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ این ای ڈی یونیورسٹی کراچی

۱۱۔ حبیب اللہ راجہ: لیکچرار عربی سرسید گرلز ڈگری کالج ناظم آباد کراچی

۲۱۔ محمد لئیق: لیکچرار اسلامیات گورنمنٹ ڈگری کالج بفرزون کراچی

۳۱۔ عبدالرحمٰن صدیقی: لیکچرار شعبہ عربی، انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی

۴۱۔ عبداللہ ایم یوسف خان: لیکچرار شعبہ عربی، انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی

۵۱۔ مفتی محمد عتیق: لیکچرار، کالج آف ایجوکیشن کراچی

۶۱۔ ڈاکٹر آصف سلیم، پروفیسر شعبہ عربی، کراچی یونیورسٹی

۷۱۔ ڈاکٹر محمد نواز، پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، اقراء یونیورسٹی کراچی

۸۱۔ امبر مہر: لیکچرار، میری ٹائم سائنس کالج کراچی

۹۱۔ ڈاکٹر خان حافظ منیر احمد: شعبہ تقابل ادیان، سندھ یونیورسٹی جام شورو

۰۲۔ محمد علی لغاری: شعبہ اسلامی تاریخ، سندھ یونیورسٹی جام شورو

۱۲۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق گھانگرو: شعبہ علوم اسلامیہ، مہران یونیورسٹی جام شورو

۲۲۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم سومرو: شعبہ اسلامی تاریخ، سندھ یونیورسٹی جام شورو

۳۲۔ ڈاکٹر سیف اللہ بھٹو: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، قائد عوام یونیورسٹی

۴۲۔ محمد افتخار: لیکچرار اسلامیات، گورنمنٹ ماڈل کالج میرپور خاص سندھ

۵۲۔ ڈاکٹر مفتی اعجاز: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیہ، اسراء یونیورسٹی حیدرآباد

۶۲۔ عبدالحمید: لیکچرار شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ سچل سرمست کالج آف آرٹس اینڈ کامرس

حیدرآباد

۷۲۔ ڈاکٹر عبدالعزیز، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ سچل سرمست کالج آف آرٹس اینڈ کامرس حیدرآباد

۸۲۔ خالد رسول: لیکچرار شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج ٹنڈو محمد خان

۹۲۔ مولا بخش محمدی: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ پاکستان کالج سید پور ضلع بدین

۰۳۔ محمد بشیر احمد: اسسٹنٹ، مہران یونیورسٹی خیرپور سندھ

۱۳۔ ڈاکٹر سجاد علی رئیسی: ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیرپور

۲۳۔ پروفیسر سرفراز علی کوریجو، چیئرمین شعبہ آئی آر، خیرپور یونیورسٹی

۳۳۔ محمد طاہر سندھی: لیکچرار، گورنمنٹ کالج فارمین بفرزون کراچی

۴۳۔ سید محمد بنوری: استاد، جامعہ بنوریہ کراچی

۵۳۔ سید جاوید صدیق، ڈائریکٹر UNITE کراچی

27-28 اپریل کو کراچی میں ہونے والی دوروزہ تربیتی ورکشاپ کی تصویری جھلکیاں

نشست اوّل: تعارف، پس منظر اور لائحہ عمل

صدارت: ڈاکٹر قبلہ ایاز (سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی)

استقبالیہ کلمات: محمد عامر رانا (ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز)

ڈاکٹر قبلہ ایاز

ہمارا ملک جن نامساعد حالات سے گزر رہا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ اجتماعی دانش سے اس کا کوئی حل سامنے لایا جائے۔ پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز گزشتہ کئی سالوں سے اربابِ فکر و دانش کے ساتھ مل کر ایسی نشستیں ترتیب دے رہا ہے جن میں بہت سی قابل قدر تجاویز و آراء سامنے آئی ہیں۔ آج کی دنیا مابعد عالمگیریت کی دنیا ہے جس میں معاشرت کو علم کے دائرے میں تشکیل دینے کی مساعی ہو رہی ہے تاکہ بعد ازاں علم پر مبنی معیشت تشکیل دی جاسکے۔ قدیم زندگی کا منظر نامہ اب عہد رفتہ میں بدل چکا ہے۔ کسی زمانے میں اکثریت مذہب یا نسل کے معنوں میں استعمال ہوا کرتے تھے اور اسی بنیاد پر معاشرے بنتے تھے مگر آج معاشروں میں تنوع آچکا ہے۔ برطانیہ کسی زمانے میں خالصتاً گوروں اور مسیحوں کا ملک تھا مگر اب یہاں مسلمان اور ہندو بھی بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ چنانچہ آج دنیا میں کثیر المذاہب معاشرے تشکیل پا رہے ہیں۔ اگرچہ ہماری زندگیوں میں مذہب ایک اہم اثاثہ ہے تاہم دیکھنا یہ ہے کہ اس بدلتی ہوئی دنیا میں ہم دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ کس طرح کا رہن سہن رکھ سکتے ہیں؟ کیا ماضی میں بھی ایسی کوئی مثالیں موجود رہی ہیں، یقیناً رہی ہیں۔ آج ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم اپنے ہاں کیسے مذہبی و سماجی ہم آہنگی کو فروغ دے سکتے ہیں؟ یہی آج کی نشست کا موضوع ہے۔

محمد عامر رانا

ہمارے یہاں پر مل بیٹھنے کا مقصد مسلم سماج کو اور خاص کر پاکستانی سماج کو درپیش چیلنجوں کا احاطہ کرنا ہے۔ یہاں جو عمومی بے چینی ہے جس کے باعث ہمارے مختلف طبقات خواہ وہ مذہبی ہوں، لسانی ہوں یا ثقافتی ہوں یا ان کا تعلق برادری کی کسی بھی سطح سے ہو ان کے درمیان عدم اعتماد کا جو رشتہ بن گیا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ مسلم اور خاص طور پر پاکستانی سماج میں علم کی گنجائش کم

ہوئی ہے۔ علمی مکالمے کا کم ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاشرے نے اپنے لیے ایک ایسے منہج کو حاصل کرلیا ہے جہاں پر تمام چیزوں پر اتفاق رائے ہوگیا ہے یا پھر یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاشرے کی علمی صلاحیتیں منجمد ہوکر رہ گئی ہیں۔ یہ ایک بڑا چیلنج ہے اور پھر اس کے ساتھ بے چینی بھی، ہمارے ہاں جب مکالمے کے ساتھ علمی روایت کی بھی کمی نظر آئے گی تو خاص مفاداتی گروپ وجود میں آنا شروع ہوجاتے ہیں جو حالات کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ گروہ کئی قسم کے ہوسکتے ہیں۔ جب معاشرے اس قسم کی صورتحال سے گزرتے ہیں تو کہیں پر یہ داعش کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور کہیں پر یہ عدم رواداری اور تشدد کی صورت میں، مجموعی طور پر ایک ایسی فضا بن جاتی ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے۔ ایک ہی وقت میں ایک گروہ ظالم بھی ہوتا ہے اور ایک ہی وقت میں وہ مظلوم بھی۔ یہ اس صورتحال کا پس منظر ہے۔ 2005ء میں ہم نے اس مسئلے پر کام کا آغاز کیا۔ ہم نے پہلے پانچ سال یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ مسائل کی نوعیت کیا ہے ؟ اور کس طریقے سے ہمارے مسائل اجتماعی زندگیوں پر اثر انداز ہورہے ہیں۔ ہمارا رابطہ علمائے کرام اور اہل دانش کے ساتھ رہا۔ پالیسی سازوں اور عام آدمی سے بھی رہا۔ جب ہم نے ایک اچھا خاصا ڈیٹا اکٹھا کرلیا تو اس کا تجزیہ کیا گیا۔ اس بنیاد پر ہم نے کئی اقدامات اٹھائے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ علمائے کرام کی رہنمائی معاشرے کے سدھار میں بہت ضروری ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ پاکستانی سماج کی تشکیل میں ان کا کردار نہایت اہم ہے۔ دوسرا یہ کہ رائے سازی کا عمل چند ایک اداروں کے لئے مخصوص ہے اور علمائے کرام ان میں سے ایک ہیں۔ ان کو اس کا ادراک بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ دو تناظر تھے جب ہم نے اس پس منظر میں پاکستان بھر سے سماجی، علمی، سیاسی اور مذہبی پس منظر رکھنے والے 70 کے قریب علمائے کرام کو ایک سہ روزہ ورکشاپ میں اکٹھا کیا تو جو آراء سامنے آئیں ان کو پانچ گروپوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا گروپ فرقہ واریت کے خاتمے میں علمائے کرام کے کردار سے متعلق تھا اس سلسلے میں جو تجاویز دی گئیں وہ ہماری ویب سائٹ پر بھی موجود ہیں اور فری ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہیں۔ اس گروپ نے 20 کے قریب تجاویز دیں جن میں کہا گیا کہ مسالک کے درمیان مشترکات کو فروغ دیا جائے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ملکی سطح پر ایک مسلکی فورم تشکیل دیا جائے جو تمام مسالک کے علمائے کرام اور مفتیان

عظام پر مشتمل ہو صرف وہی فتویٰ جاری کرنے کا مجاز بھی ہو۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مذہبی ہم آہنگی کے لئے مختلف مدارس کے طلبا کے درمیان روابط کو فروغ دیا جائے اور طلباء کے مابین مکالمے کا آغاز کیا جائے۔ دینی مدارس، مساجد اور جامعات کے نام قابل قبول ہونے چاہئیں۔ میڈیا فرقہ واریت کو ہوا دینے والے پروگرام نشر نہ کرے۔ ''پرتشدد رجحانات کے خاتمے میں علماء کا کردار'' دوسرا گروپ تھا۔ سیاسی، سماجی اور دینی امور میں علمائے کرام کا کردار کیا ہونا چاہئے۔ تکفیر و خروج جیسے معاملات پر تمام مکاتب فکر کے علماء کے فورم تشکیل دیئے جائیں۔ تیسرا گروپ بدامنی کے سیاسی اور سماجی محرکات کے حوالے سے علمائے کرام کی تجاویز سامنے لایا۔ چوتھے گروپ کے ذمے یہ تھا کہ برداشت کے کلچر کو کیسے فروغ دیا جائے۔ اس گروپ نے بھی بڑی اچھی تجاویز دیں کہ منبر اور لاؤڈ سپیکر کو کیسے استعمال کیا جائے۔ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان مکالمے کو ایک مستقل ادارے کی شکل دی جائے۔ معاشرے کے مختلف طبقات میں داخلی تنازعات کو کم سے کم کرنے اور افہام و تفہیم کی فضا پیدا کی جائے۔

پانچواں گروپ مدارس کے کردار پر تھا۔ عام مدارس میں مختلف مکاتب فکر کی کتابیں ہونی چاہئیں۔ یہ جو بڑی مشہور بات ہے کہ اپنا مسلک چھوڑو نہ اور دوسرے کا چھیڑو نہ۔ انھوں نے کہا کہ اس بات کو عام کیا جائے۔ ان تجاویز کی روشنی میں ہم نے آئندہ سات سال کا پروگرام تشکیل دیا۔ ہم نے مدارس کے طلباء کے درمیان مکالمے کو فروغ دینے کی کوشش کی ان کے مکالمے کا اہتمام عمومی یونیورسٹیوں کے طلباء کے ساتھ کیا۔ ہم نے علمائے کرام کے مابین مسائل پر علمی مذاکرے کروائے۔ مثلاً ایک مکالمہ تکفیر و خروج سے متعلق تھا جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اسلام جمہوریت اور پاکستان، کا ایک پورا تناظر تھا کہ کس طرح شدت پسند پاکستان کے آئین کو چیلنج کرتے ہیں۔ برصغیر کی دینی روایت میں برداشت کا عنصر، جسے مفتی زاہد صاحب نے ترتیب دیا۔ ہم نے پوری کوشش کی کہ مکالمے کو فروغ دیا جائے۔ اور اسے صرف مدرسے سے وابستہ دینی طبقات تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کو عمومی تعلیمی اداروں کے شعبہ اسلامیات و عربی تک پھیلایا جائے۔ یہ تربیتی ورکشاپ نہیں بلکہ مکالمے کا ایک فورم ہے۔ مکالمے کے آداب بھی یہی ہیں کہ آپ کو اپنی رائے کا حق ہے بشرطیکہ یہ موضوع کے حوالے سے ہو اور یہ مکالمے کے فروغ

کا سبب بنے نہ کہ اس میں رکاوٹ کا۔

دوسری نشست: مسائل کی نشاندہی اور تجاویز

محمد لئیق: شعبہ علوم اسلامیہ گورنمنٹ ڈگری کالج بفرزون

ایک کلاس جس میں مختلف ذہنیت کے بچے ہوتے ہیں وہاں جس طریقے سے استاد کلاس کے ماحول کو ہم آہنگ رکھتا ہے اسی طریقے سے اگر وہ اپنا یہ کردار پھیلائے تو معاشرے میں بھی سماجی ہم آہنگی کو رواج مل سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحئی مدنی: این ای ڈی یونیورسٹی کراچی

باہمی رواداری یا ہم آہنگی اگرچہ علماء کی ذمہ داری ہے لیکن ایک بڑی ذمہ داری انتظامیہ کی بھی ہے۔ایک طرف ہمیں اپنے طلباء، علمائے کرام اور عوام کو یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنا کردار ادا کریں، دوسری جانب ہمیں اپنی افسر شاہی اور سیاسی قیادت پر بھی زور ڈالنا ہوگا کیونکہ اہم ترین کردار انہی کا ہے۔

ڈاکٹر سیف اللہ بھٹو: اسسٹنٹ پروفیسر قائد عوام یونیورسٹی آف انجینئرنگ نواب شاہ

میں اپنے طلباء کو ہمیشہ کہتا ہوں کہ آپ کے دو مقاصد ہیں ایک تو یہ کہ امتحان پاس کرنا ہے اور دوسرا عملی زندگی میں جا کر کام کرنا ہے۔آپ کے اندر مذہبی طور پر برداشت کا عنصر ہونا چاہئے، اپنی رائے ضرور دیں مگر دوسرے کی سنیں بھی۔

ڈاکٹر مفتی اعجاز علی کھوسو: اسسٹنٹ پروفیسر اسرا یونیورسٹی حیدرآباد

میں نے اپنے طلباء کو ہمیشہ تاکید کی کہ اپنے عقیدے کی بنیاد پر کسی دوسرے کو تنگ نہ کریں۔کیونکہ مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے محفوظ رہیں۔ پڑھنے لکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہمیں اندھیرے سے نکل کر روشنی کی طرف جانا ہے۔اس میں اساتذہ کا کردار اہم ہے کیونکہ وہی ذہن سازی کر سکتے ہیں، ہر بندہ اپنے عقیدے کے حوالے سے خدا کو خود جواب

دہ ہے۔آپ کسی کو تنگ نہ کریں بلکہ محبت سے چلیں، کیونکہ انسان محبت کا ہی نام ہے۔اس چیز کا بہت فقدان ہے۔

محمد طاہر عبدالقیوم سندھی: گورنمنٹ کالج فار مین بفرزون کراچی

میری ساری زندگی مکہ مکرمہ میں گزری، حفظ قرآن بھی بیت اللہ شریف میں کیا۔یہاں جامعہ الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے فارغ التحصیل ہوں۔پی ایچ ڈی سکالر ہوں۔پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں، اتنی ہی زیر طبع ہیں۔مختلف اخبارات و جرائد، تحقیقی جرائد میں بھی مضامین لکھتا ہوں۔میرے گاؤں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں بچے میرے پاس پڑھتے ہیں۔اس طرح کے سوالات میرے پاس آتے رہتے ہیں۔میں کوشش کرتا ہوں کہ میرے جوابات سے غیر مسلمان بچوں کی دل آزاری نہ ہو۔میں اپنے سکول میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سماجی ہم آہنگی کا ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

ڈاکٹر معروف بن رؤف: اسسٹنٹ پروفیسر یونیورسٹی آف لورالائی بلوچستان

امت مسلمہ کے زوال کی مختلف وجوہات میں سے ایک وجہ یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں دین و دنیا کی تقسیم ہے حالانکہ ہم روزانہ نماز کے اندر فی الدنیا حسنہ وفی الآخرۃ حسنہ مانگتے بھی ہیں۔اس حوالے سے PIPS کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اس خلیج کے خاتمے میں اپنا کردار ادا کرنے کیلئے ہمیں یہاں مدعو کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد نواز: اقراء یونیورسٹی کراچی

ہم نے مختلف مذاہب میں رواداری اور ہم آہنگی میں مذہب کے کردار پر کچھ سیمینارز کرائے۔ہم نے دیکھا کہ یہ کانفرنسیں بڑی موثر ثابت ہوتی ہیں۔میں سب سے کہوں گا کہ آپ باقی کاموں کے ساتھ ساتھ دو کام ضرور کریں۔ایک یہ کہ آج کی ورکشاپ کا عملی نقشہ اپنی کلاس کے اندر ضرور دیں۔دوسرا یہ کہ اپنی کلاس کے بچوں میں اخلاقیات میں جو کمی آرہی ہے اس پر بات کریں کہ مذہبی رواداری معاشرے کا بنیادی تقاضا ہے اس کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا۔

سیرت طیبہ کی روشنی میں جو اسباق ہمیں ملے کہ کس طریقے سے آپ نے غیر مسلموں کو رواداری کا پیغام دیا، پھر میثاق مدینہ میں کس طریقے سے رواداری کا سبق دیا گیا۔ یہود کو بھی شہریت کا حق دیا گیا۔

ڈاکٹر عبدالرزاق گھانگرو: پروفیسر مہران یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی جامشورو

اساتذہ کا کردار سماجی ہم آہنگی میں بہت اہم ہے۔ ہمارا تعلق جس مسلک سے بھی ہو مگر طلباء میں یہ شائبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارا مسلک کیا ہے؟ پڑھاتے وقت یہ نکتہ مرکوز رکھنا چاہیے۔

مولا بخش محمدی: گورنمنٹ پاکستان کالج سید پور ضلع بدین

میرا تعلق تھرپارکر سندھ سے ہے، میرا علاقہ انتہائی پسماندہ ہے۔ وہاں مسلمان اقلیت میں اور ہندو اکثریت میں ہیں۔ میں نے وہاں 24 سال پڑھایا ہے، آج تک کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا کہ کسی ہندو کی دل آزاری ہوئی ہو یا کسی مسلمان نے زیادتی کی ہو۔ اگر ہم سب میں ایک دوسرے کے لئے مفاہمت ہو تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔

عبدالحمید آرائیں: لیکچرار سچل سرمست کالج حیدر آباد

میں ایک ذاتی تجربہ شیئر کرنا چاہوں گا ایک ادارہ ورلڈ ٹیررازم ڈیٹا بیس ہے ان کے ایک مطالعہ کے مطابق دنیا میں دہشت گردی کے واقعات میں 95 فیصد کے پیچھے مذہب کی بجائے سیاست ملوث ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارا میڈیا اور سیاستدان اسے مذہب سے جوڑ دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے ہاں سماجی ہم آہنگی اور رواداری کا جذبہ عوام کے اندر موجود ہے۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ قدرتی آفات کے موقع پر ہم سب ایک ہو جاتے ہیں مگر ضرورت اس امر کی ہے ہم ایسے جذبات عام کریں۔

بشیر احمد: لیکچرار مہران یونیورسٹی خیرپور سندھ

آج 60، 70 سال کے بعد ہم بات کر رہے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں سماجی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس میں ہر جگہ کمی، کوتاہیاں موجود ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں

کہ ہمارے لوگ جب ملک سے باہر جاتے ہیں تو وہ رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر اپنے ملک میں نہیں کرتے۔

خورشید ندیم: دانشور، کالم نگار و اینکر

میرا تعلق اخبار اور میڈیا سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستانی معاشرے کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تشکیلِ نو اب ناگزیر ہو چکی ہے۔ اس کو کیسے ایک ڈگر پر ڈالا جا سکتا ہے اس کیلئے حسب توفیق کوشش کرتا رہتا ہوں۔

ڈاکٹر حافظ منیر احمد خان: چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک کلچر سندھ یونیورسٹی جامشورو

ہمیں سماجی ہم آہنگی کیلئے سیرت طیبہ سے رجوع کرنا ہوگا۔ اس کیلئے اساتذہ کی تربیت کی جائے۔ جتنے نرم خو حضور ﷺ تھے اسی کی پیروی ہمارے اساتذہ کو کرنی پڑے گی۔ اگر اساتذہ کے پاس کوئی سوال آ جائے جس کا جواب نہ ہو تو وہ طلباء کو ڈانٹ ڈپٹ کر بٹھا دیتے ہیں۔ ہمارے اندر جو سختی ہے اس کو نکالنا پڑے گا۔ اپنا تزکیہ کرنا پڑے گا۔ حضور ﷺ کی ایک نگاہ سے صحابہؓ کا تزکیہ ہو گیا۔

محمد رفیق: گورنمنٹ انٹر کالج کوئٹہ

ہمیں اخلاقیات پر زور دینے کی ضرورت ہے ایک تعلیم یافتہ زمانہ کے باوجود آج بھی اسے جہالت کا دور کہا جا سکتا ہے۔ علم بہت ہے مگر اس پر عمل کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر سید باچا آغا: اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ

مذہبی رواداری کے حوالے سے بات مسلّم ہے مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ اساتذہ مخلص ہو کر اپنا کردار ادا کریں۔ مجھے مدرسے اور کالج میں بڑا فرق دکھائی دیتا ہے۔ ریاست کا کردار سماجی ہم آہنگی میں بہت زیادہ ہے۔

ڈاکٹرعبدالعلی اچکزئی: صدرشعبہ اسلامیات، بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ

آج ہم جن مسائل سے دوچار ہیں ان کی ایک بڑی وجہ عدم برداشت بھی ہے۔اس اہم موضوع کے حوالے سے نصاب پر کام ہونا چاہیے تا کہ معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔

محمد عامر رانا

یہاں دو چیزوں کا تذکرہ ہوا ایک ریاست کا اور دوسرا ذاتی کردار کا۔میرا خیال ہے کہ اس چیز کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ریاست ہے کیا؟ کیا یہ سماج سے الگ چیز ہے۔ہم ریاست کا تصور کیا دیکھتے ہیں؟ کیا ہمارا عمل ہی سماج کی تشکیل نہیں کرتا۔ کیا یہ ایک ریاست کا اظہار نہیں؟ ریاست ہم ہی ہیں۔اس سوال کو ضرور زیر بحث آنا چاہیے۔میں کبھی کبھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کسی بھی طبقے یا گروہ سے شکایت ہوسکتی ہے لیکن میں اس سے الگ نہیں ہوں۔ جب میں خود کو الگ سمجھوں گا تو یہی ہم آہنگی کی نفی ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے، میرا خیال ہے کہ اس کو زیر بحث آنا چاہیے۔مذہبی اور لسانی تنوع کے حوالے سے سندھ اور بلوچستان کا بہت اہم کردار ہے۔ چیلنجز بہت ہیں، ہمارا معاشرتی عدم توازن بھی اس سلسلے میں اہم ہے۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز

گئے وقتوں میں استاد اور طالب علم کا جو رابطہ اور رشتہ تھا اسے ابلاغ کے نئے ذرائع نے کمزور کیا ہے۔کلاس روم کے بعد کی سرگرمیاں کم ہوگئی ہیں،طلباء کہیں اور مصروف ہو گئے ہیں۔ اساتذہ پر بھی بہت بوجھ آیا ہے لیکن اس کے باوجود اساتذہ اور طالب علم نئے رابطوں سے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اب ان رابطوں کو سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کیلئے کیسے استعمال کیا جائے؟ کیونکہ کسی زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ تعلیمی ادارے جزیرے ہیں مگر اب یہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کے اثرات معاشرے میں دکھائی دینے چاہئیں۔ ہمارے طالب علم ہمارے سفیر ہوں۔

تیسری نشست: گروپ رپورٹس اور ان پر بحث

صدارت: خورشید ندیم (محقق، دانشور و کالم نگار)

گروپ اے کی رپورٹ

ڈاکٹر پروفیسر محمد عبدالعلی اچکزئی

انتظامیہ یا ریاست اس کی ذمہ دار ہے، وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر دباؤ کا شکار ہے، ہم نے اس کے اسباب کا ذمہ دار حکومت کو ہی قرار دیا ہے۔اس کے بعد بین الاقوامی طاقتوں کی سازش، یہ کشمکش ازل سے ہے۔تعلیمی ادارے بھی سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں اپنا کردار ادا نہیں کر رہے۔ ہمارا نصاب جس میں سرکاری سکول ہوں یا مدارس وہاں توازن نہیں ہے۔ ہر مکتبہ فکر اپنا اپنا پرچار کرتا ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے جس سے فرقہ واریت بڑھتی ہے۔اگر ہر ادارے میں چاروں مکتبہ فکر کی فقہ کو پڑھایا جائے تو بہت حد تک بہتر صورتحال پیدا ہوسکتی ہے۔اس کے بعد استاد کا کردار آتا ہے وہ اپنا کردار ادا نہیں کر رہے۔اس کے بعد معاشرہ ہے جہاں نیچے سے لے کر اوپر تک سب ذمہ دار ہیں۔ہم سب آدم کی اولاد ہیں، ہماری ماں ایک ہے ہمیں اس تصور کو اجاگر کرنا ہوگا۔

اس کے بعد بدعنوانی کا نمبر آتا ہے۔معاشرے میں اخلاص کا اور تربیت کا بھی فقدان ہے۔قول و فعل کا تضاد ہے۔حکمران سے لے کر استاد تک سب عملی زندگی میں زیرو ہیں۔اسی طرح احتساب کا تصور ہی ختم ہوگیا ہے۔ ہر شخص اپنی خوبیاں دیکھتا ہے اور دوسرے کی خامیاں دیکھتا ہے۔عدم برداشت بہت بڑھ چکی ہے۔

ان مسائل کو حل کرنے کیلئے انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ سب کو اپنی اپنی حدود و قیود میں آنا ہوگا۔ جب ایک ادارہ اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے تو خرابی شروع ہو جاتی ہے۔میرٹ کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ اگر آپ کسی غیر مستحق کو آگے لائیں گے تو حالات کی تباہی ہوگی۔حکومت کرپشن کا خاتمہ اپنے آپ سے کرے، ہمیں اپنا احتساب بھی کرنا ہوگا۔اپنے وسائل پر اکتفا کرنا ہوگا، اپنے مسائل کو عالمی فورمز پر لے کر جائیں۔ تعلیمی اداروں کو معتدل ہونا چاہیے، اگر ان کا جھکاؤ کسی ایک

جانب ہوگا تو پھر ہم آہنگی کیسے ہوگی۔ سائنسی نصاب میں بھی اخلاقیات کو پڑھایا جائے۔ فرقہ واریت کے خاتمے کیلئے مدارس اور دنیاوی تعلیمی اداروں کے مابین عدم مساوات ختم کی جائے۔ معاشرے میں خاموش تماشائی کا کردار ختم کیا جائے۔ حق کے ساتھ کھڑا ہونے کی روایت شروع کی جائے۔ معاشرے کا ہر فرد ملت واحدہ کا تصور اجاگر کرے۔ اخلاق و تربیت پورے معاشرے کی ہونی چاہیے۔ تحمل و بردباری کی ذمہ داری بھی پوری کریں۔

خورشید ندیم:

ان تجاویز پر فورم اوپن کیا جاتا ہے۔ اپنی آراء دیجئے۔

محمد لئیق:

یہ تجاویز عمومی نوعیت کی ہیں کہ حکومت کرپشن سے پاک ہو، تحمل ہو، جو مسئلہ ہمیں میدانِ عمل میں درپیش ہے اس کے حل کی جانب کیا عمل کیا جائے۔ اس پر بات نہیں کی گئی، آپ گڈ گورننس کی بات کرتے ہیں لیکن اس خاص مسئلے پر خاص اقدامات کی بات کی وضاحت کی جائے۔

جواب: نصاب متوازن ہونا چاہیے، دینی مدارس کے اندر سب نے اپنے اپنے مکتبہ فکر کی رو سے ایک کورس بنا رکھا ہے ہمارے گروپ نے تجویز دی کہ اس کورس پر نظر ثانی کی جائے، جب ہم سماجی ہم آہنگی یا مذہبی رواداری کی بات کرتے ہیں تو میدان کافی وسیع ہو جاتا ہے۔ اگر دینی طبقے فرقہ واریت کا شکار رہیں گے تو کہاں کی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری!

بشیر احمد:

جن جماعتوں نے ہمیں فرقے کی بنیاد پر تقسیم کر رکھا ہے ایسی جماعتیں صرف مذہبی نہیں بلکہ لسانی بھی ہیں۔ اس لئے ہم آہنگی کی ذمہ داری صرف مذہبی جماعتوں پر نہیں بلکہ سیاسی اور لسانی جماعتوں پر بھی ہے۔

ڈاکٹر مفتی اعجاز:

اگر ریاست کے تین ستون اور اس کے ساتھ ہم سب مل کر اپنی اپنی حد میں اور دائرے میں

رہ کر کام کریں تو معاشرہ متوازن ہوگا۔

عبدالحمید آرائیں:

PIPS اور اس جیسی تنظیمیں گزشتہ کئی سالوں سے یہ کام کر رہی ہیں مگر اس کے نتائج معاشرتی سطح پر نظر نہیں آ رہے۔ اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟

خورشید ندیم:

آپ کی ملتِ واحدہ سے کیا مراد ہے، ملت اسلامیہ یا ملت آدمؑ؟

جواب: ملتِ آدمؑ۔ اس کیلئے آیت بھی ہے کہ یہ خاندان، کنبے، قبیلے الگ الگ آئے۔ یہ صرف ہماری پہچان کیلئے ہیں ہمارے نبی ﷺ ایک یہودی عورت کا جنازہ دیکھ کر اس کے احترام میں رک گئے۔ اصل مسئلہ احترام انسانیت ہے۔ اب ہم انہی کا نام لے کر باہم دست وگریبان ہوتے ہیں۔

گروپ بی کی رپورٹ

ڈاکٹر محمد نواز: پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، اقراء یونیورسٹی کراچی

رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق کہ مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا۔ یہ سعادت ہمارے حصے میں بھی آئی ہے۔ ہمارے گروپ نے سفارش کیا کہ:۔

ہماری یونیورسٹیوں میں آپ اسلامی تعلیم پڑھا رہے ہیں اور آپ نے آپشن بھی رکھا ہے کہ آپ نے اسلامیات پڑھنی ہے یا اخلاقیات پڑھنی ہے۔ اگر غیر مسلم ہیں تو یہ آپشن موجود ہے، اس کے باوجود کئی یونیورسٹیوں میں غیر مسلم طلباء از خود یہ کہتے ہیں کہ انہیں اسلامیات ہی پڑھنی ہے۔ اب یہ پڑھانے والے استاد پر منحصر ہے کہ وہ کیا پڑھائے اور کیسے پڑھائے۔ غیر مسلم طلباء کو کلاس کے اندر کسی امتیاز کا شکار نہیں ہونا چاہیے، استاد کا رویّہ مساوات پر مبنی ہونا چاہیے۔ ہر مذہب اخلاقیات پر زور دیتا ہے اس لئے استاد اس چیز کو مدنظر رکھے۔ اسی طرح اساتذہ اپنے لیکچر کی تیاری کر کے آئیں۔ یہ نہ سوچیں کہ اسے پڑھاتے ہوئے 20 سال ہو چکے ہیں، اب اسے تیاری

کی کوئی ضرورت نہیں۔

استاد ایک ماہر نفسیات بھی ہے۔اسے معلوم ہونا چاہیے کہ معاشرے میں کیا مسائل ہیں۔ سماجی ہم آہنگی کیلئے اس کا کردار کیا ہونا چاہئے،اسی طرح سیکنڈری تعلیم کے نصاب میں سماجی ہم آہنگی کا مضمون شامل ہونا چاہئے اور سکولوں کے اساتذہ کیلئے ایسی ورکشاپس منعقد کی جائیں۔استاد کو اپنے قول وفعل،رویّوں میں غیر جانبدار ہونا چاہیے۔آپ کو صرف کاغذوں میں نہیں بلکہ حضورﷺ کی طرح عملی طور پر رول ماڈل بننا ہوگا۔

سوالات: کیا یہ ضروری نہیں کہ میڈیکل اور انجینئرنگ کے طلباء کیلئے بھی اسلامک اسٹڈیز کا مضمون باقاعدہ طور پر نصاب میں شامل کیا جائے؟

ڈاکٹر عبدالحمید نیئر:

آپ نے صحیح نشاندہی کی کہ نصاب میں مذہبی رواداری کی بات ہونی چاہیے مگر اس سے پہلے کہ کیا یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ایسی تمام باتیں نصاب سے نکال دی جائیں جو رواداری کے خلاف جاتی ہیں اور ان کی نشاندہی کئی بار ہو چکی ہے۔

جواب: جی بالکل جب آپ ضروری چیزوں کو نصاب میں شامل کریں گے تو پھر غیر ضروری کو نکال بھی دینا چاہیے۔

ڈاکٹر زاہد علی زاہدی: کراچی یونیورسٹی چیئرمین شعبہ اسلامیہ

طالب علموں کو اختلاف کے آداب سکھانا ہوں گے۔دوسری چیز یہ کہ ان اختلافات کے ساتھ معاشرے میں رہنے کے آداب کیا ہوتے ہیں۔طلباء کو یہ بھی سکھانے کی ضرورت ہے۔

محمد طاہر سندھی: پی ایچ ڈی سکالر

نصاب میں غیر ضروری چیزوں کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحمید نیئر

دو چار چیزیں مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں آپ غیر مسلم بچوں کو بھی اسلامی دینی تعلیمات

دیتے ہیں۔یہ غلط بات ہے،دوسری تیسری جماعت کے تمام بچوں بشمول غیر مسلم بچوں کے لئے لازمی ہے کہ ان کو پہلا کلمہ ترجمے کے ساتھ سکھائیں یاد کروائیں،ان کو درود شریف ترجمے کے ساتھ پڑھائیں،یاد کروائیں،روزہ رکھنے کی دعا اور کھولنے کی دعا پڑھائیں یاد کروائیں۔نمازوں کے نام،اوقات وغیرہ یہ تمام چیزیں اسلامی دینی تعلیمات ہیں۔یہ غیر مسلموں کو نہیں پڑھانی چاہئیں،ظاہر ہے کہ غیر مسلم بچے اسے اچھا نہیں سمجھتے۔اگر آپ اردو کی کتاب میں دین اسلام کے مضامین پڑھا رہے ہیں تو یہ درست نہیں۔اس سے غیر مسلم بچوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ایک زمانے میں اسلامیات کے نصاب پر ملک کے بعض حصوں میں فسادات ہو گئے تھے کیونکہ یہاں ہر فرقہ مذہبی تعلیمات پر بھی اپنی الگ رائے رکھتا ہے۔اس طرح کی چیزیں نصاب میں بہت زیادہ ہیں لہٰذا ان کو نکالنے کی ضرورت ہے۔

سوال: ہم امریکا میں نہیں بیٹھے،پاکستان میں بیٹھے ہیں۔پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا،اگر ہم اس کے ساتھ اسلامیہ کا لفظ ہٹا کر صرف جمہوریہ رہنے دیں تب بھی یہ حقیقت ختم نہیں ہو سکتی۔اللہ نے جو کوڈ انسانیت کیلئے دیا وہ اسلام ہے اس لئے اس کی تبلیغ ہم سب پر فرض ہے۔جب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اس کے بعد ایک ایک فرد اس بات کا پابند ہے،ہمیں اپنے اپنے طور پر یہ کام کرنا ہے۔ہاں اس بات پر ہم آپ کے ساتھ متفق ہیں کہ جبراً کوئی چیز غیر مسلم بچے کے ساتھ روا نہ رکھی جائے یہ غلط ہوگا۔لیکن یہ کہنا کہ اس کو کورس سے نکال دیا جائے تو یہ جمہوریت کے ہی خلاف ہے کہ آپ حق بات کسی کو بتائیں ہی نہیں۔اب تو پڑھے لکھے بندے بھی یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ ''اپنا مسلک چھوڑو نہیں اور دوسروں کا چھیڑو نہیں''۔یعنی حق کے دروازے بند کر دو،اگر آپ غلط بھی ہیں تو قائم رہیں۔بچوں کی تربیت تو کرنی ہے اگر غیر مسلم بچہ مسلمان ہوتا ہے تو یہ آپ کیلئے کتنا بڑا اجر ہے۔آپ کو دعوت تو دینی ہے،پچھلے دنوں بہت سارے لوگوں نے کہا کہ اسلامیات کی کتابوں سے جہاد والی آیات نکال دی جائیں۔جہاد القاعدہ،حافظ سعید یا طالبان کا نہیں ہے جہاد اسلام کا اہم باب ہے اس کی فرضیت سے ہم انکار نہیں کر سکتے لیکن اس کا جو طریقہ کار رہے اس کو سمجھنے کی بہت ضرورت ہے۔

جواب: اگر نصاب کو جمہوریت سے جوڑ دیا جائے تو پھر بندے ماترم پر ہم نے جو احتجاج کیا تھا وہ کیوں کیا تھا جمہوریت تو ان کی تھی، انہی کا حق تھا بلاوجہ ہمارے بزرگوں نے احتجاج کیا۔ یہ تو ہر طالب علم کا حق ہے کہ اسے برابری کی بنیاد پر تعلیم دی جائے وہ بھی اسی طرح ریاست کا شہری ہے جس طرح کوئی مسلم بچہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نصاب میں اسے وہ چیزیں نہ پڑھائی جائیں جو اس کے مذہب کے مطابق درست نہیں ہیں۔ ایک زمانے میں کراچی بورڈ میں اسلامیات کے شیعہ اور سنی پرچے الگ الگ کئے گئے پھر یہ ختم کر دیئے گئے۔ شیعہ طلباء بھی سنی نماز اور وضو کا طریقہ پڑھنے پر مجبور ہیں۔ اس طرح سے نصاب نہیں ہونا چاہیے۔ دعوت دینی چاہیے لیکن وہ بچہ جو ابھی اپنا مذہب بھی سمجھ نہیں پایا اس کو ہم اسلام کی دعوت دینے کی کوشش کر رہے ہیں اس طرح جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں کیا ہم اجازت دیں گے کہ غیر مسلم ان کو اپنے مذہب کی دعوت دیں۔

مولوی گل محمد: بلوچستان یونیورسٹی خضدار

یہ 2008ء کی بات ہے۔ میری کلاس میں ایک ہندو لڑکا تھا جس کا نام کرشن کمار تھا۔ میں حاضری اور دوسری چیزوں پر بڑی سختی کرتا ہوں۔ وہ لڑکا میرے آفس میں آیا اور کہا کہ میں ہندو ہوں، آپ بڑی سختی کرتے ہیں میرا کیا ہوگا؟ یقین جانیں یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں نے اللہ سے مدد چاہی کہ یہ تو ہے ہی ہندو، ہم اس کو زبردستی پڑھا رہے ہیں۔ پہلے اخلاقیات کا مضمون ہوتا تھا۔ اب اس کو سورۃ الفرقان، سورۃ الحجرات پڑھنی پڑھیں گی۔ اگر نہیں پڑھے گا تو یہ فیل ہو جائے گا۔ میں نے اس لڑکے کو اپنے آفس میں بٹھایا۔ میں نے کہا کہ بیٹا مطالعہ کرنے میں کوئی حرج تو نہیں۔ میرے پاس بائبل ہے، میں تورات اور انجیل کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ میں نے اس کو کہا کہ اس میں حرج تو نہیں۔ یقین جانیں کہ اس نے بڑی محنت کی اور اس سال جب نتیجہ آیا تو اسی کرشن کمار نے اسلامیات میں پہلی پوزیشن حاصل کی حالانکہ اسی پیپر میں بہت سارے مسلمان طلباء فیل ہو گئے تھے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ اس کے بعد کسی ہندو، سکھ اور ذکری سب کے ساتھ میں کھل کر بات کرتا ہوں۔ اس سے اس ہندو لڑکے کا والد مسلمان ہو گیا کہ یہ کتنی مذہبی رواداری ہے۔ ویسے تو

ہمارا نصاب کافی بہتر ہے اس میں اگر عدم مساوات ہے تو وہ عام تعلیمی اداروں اور اشرافیہ کے اداروں کے درمیان ہے، امیر اور غریب کے درمیان ہے۔

گروپ سی کی رپورٹ

ڈاکٹر معروف بن رؤف: یونیورسٹی آف لورالائی بلوچستان

1- ہمارے گروپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہم مذہبی معاملات میں جذباتی ہیں۔

2- تعلیم میں اخلاقیات اس طرح سے موجود نہیں۔ صفورہ سانحہ کے ذمہ دار کسی مدرسے کے طالب علم نہیں تھے وہ کراچی یونیورسٹی اور آئی بی اے سے پڑھے ہوئے تھے۔ مذہبی رواداری کیا صرف مدارس کیلئے رہ گئی ہے؟ کیا عصری تعلیمی اداروں کو اس سے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

3- ہمارے ہاں تعلیم تو ہے مگر اس کے اندر تربیت کا فقدان ہے۔

4- ایک اور بات سامنے آئی کہ علم کی کمی اور استاد کا تعصب، عمومی طور پر یونیورسٹی میں استاد اس طرح کا پیپر بناتا ہے جس میں اسے چیک کرنے میں آسانی ہو یا الفاظ دیگر آنکھیں بند کر کے بھی چیک کر سکے۔ استاد کے تعصب سے مراد یہ ہے کہ اگر استاد کا تعلق کسی خاص مکتب فکر سے ہے تو وہ اپنی فکر کو اپنے طلباء پر لاگو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم طلباء کی تنقیدی صلاحیتیں پروان نہیں چڑھاتے۔

5- ہمارا معاشرہ ایک باتونی معاشرہ ہے ہم ہر چیز پر بات کرنا ضروری سمجھتے ہیں، جس کے نتیجے میں ہماری باتوں سے تاثیر ختم ہو جاتی ہے اور کم علمی کی وجہ سے طلبہ کی سوچیں متاثر ہوتی ہیں۔

6- دوسرے کی رائے کا احترام نہیں، بچے کو ابتدائی طور پر ہی ایسی تربیت دی جاتی ہے۔

7- میڈیا کا منفی کردار، ریٹنگ کے چکر میں جو چیز آتی ہے براڈ کاسٹ ہو جاتی ہے۔

8- ہماری تعلیم بنیادی طور پر کیریئر ایجوکیشن ہے۔ جامعہ کراچی میں 50 یا 60 شعبہ جات ہیں لیکن مدارس میں صرف دو شعبے ہوتے ہیں۔ آپ کسی مسجد کے امام بنیں گے یا پھر مدرس

بنیں گے، تیسرا یا چوتھا آپشن نہیں ہے۔ اس لئے جب پیٹ کا چکر ہوگا تو مذہبی رہنما بھی میڈیا کی ریٹنگ کی طرح اپنی ریٹنگ بڑھائے گا۔

تجاویز:

استاد کا علم وسیع ہونا چاہیے۔ اگر مجھے صرف امام غزالی یاد ہیں تو میں صرف انہی کی مثالیں دوں گا۔ کسی دوسرے فقہ کی بات نہیں کروں گا۔

☆ متفقہ مذہبی لٹریچر، یعنی چاروں فقہ پڑھائی جائیں۔ جن امور پر اتفاقات ہیں ان کو پرموٹ کیا جائے۔

☆ ایک نصاب کا معاملہ صرف مدارس میں نہیں بلکہ عصری علوم میں بھی ہونا چاہیے، ایلیٹ سکولز اور گلی محلے کے سکول یا سرکاری سکولوں سب میں یکساں نصاب ہونا چاہیے۔ جس طرح مدارس کے طلباء کو سائنس و کمپیوٹر کا علم ضروری ہے اس طرح عصری علوم والوں کیلئے دین کا علم ضروری ہے۔

☆ کلاس کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ بچہ وہ سوال نہیں کر پاتا جو اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔

☆ طریقہ تدریس میں جدت کی ضرورت ہے، ورنہ مقلدین ہی پیدا ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہم محقق نہیں رہے۔

ڈاکٹر سجاد علی رئیسی: شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور

معاشرے میں اس وقت رواداری ہوسکتی ہے جب ہم جس طرح اپنے مذہب کو حق گردانتے ہیں اسی طرح ان کے بارے میں بھی یہ خیال کریں کہ ان کے نزدیک ان کا عقیدہ حق پر ہے۔

ہم دیگر مذاہب کے بارے میں تحقیر آمیز خیالات رکھتے ہیں۔ اس مذہبی عصبیت کے پیچھے مذہبی جہالت کارفرما ہے۔ ایک کثیر العقائد یا تکثیریت پر مبنی معاشرہ ہی ہم آہنگی کی مثال ہوسکتا ہے۔ اسلام اس کی کئی مثالیں دیتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اسلام دوسرے مذاہب کو

تسلیم کرتا ہے تو پھر ہم کیوں نہیں کرتے۔ میرے نزدیک اسلام میں تکثیریت کی تائید ملتی ہے۔ مذاہب کو ایک دوسرے کے ساتھ زندہ رہنے کی اجازت ہے۔

پروفیسر سرفراز علی کوریجو: شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے پاس اپنے علم کو وسیع کئے بغیر کوئی راستہ نہیں ہے جب تک ہمارے ذہن کے دائرے نہیں کھلیں گے، ہم میں وسعت فکر پیدا نہیں ہوگی۔

سوال: چار فقہوں میں صرف دو ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں اور عدم رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک تجویز مدارس کے بارے میں ہے کہ مدارس میں پڑھنے سے پہلے کوئی بھی بچہ بارہ سال عمومی تعلیم حاصل کرے اور پھر مدرسہ آئے۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح تنگ نظری ختم ہوگی؟ میرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے، میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے جو مذہبی تعلیمی ادارے ہیں ان میں جدید علوم پڑھائے جاتے ہیں۔

محمد عامر رانا

علماء کا ایک وفد انڈونیشیا گیا جس میں خورشید ندیم اور ڈاکٹر قبلہ ایاز بھی تھے، ہم جانتے ہیں کہ وہاں پر دینی تعلیم کا بندوبست ہے۔ تمام سکول چاہئے سرکاری ہوں یا پرائیویٹ، وہاں ظہر سے پہلے صرف سرکاری نصاب ہی پڑھایا جائے گا مدارس کی تخصیص یہ ہے کہ ظہر کے بعد چند گھنٹے وہ دینی تعلیم دے سکتے ہیں۔ اس وقت جو تجاویز ہم نے اس سلسلے میں شرکاء سے مانگیں جن میں تمام وفاق کے سربراہان بھی شامل تھے انہوں نے کہا تھا کہ اگر ریاست ان کیلئے پاکستان میں کوئی ایسا انتظام کرے تو وہ ان کیلئے قابل قبول ہوگا۔ تائید تو موجود ہے مگر کیا ریاست ایسا کرے گی یا کرنا چاہے گی۔

خورشید ندیم

ہمارے سامنے بنیادی موضوع یہی تھا کہ مذہبی وسماجی ہم آہنگی میں اساتذہ کا کردار کیا

ہے؟ اسی لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ معاشرہ ایک اکائی ہے اس میں مختلف طبقات ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان سب کا ایک دوسرے پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے تو یقیناً ایک مشین کی طرح کی صورتحال سامنے آتی ہے جہاں ہر پرزہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ استاد، اس ساری مشین کو پرامن طریقے سے چلانے میں کیا کردار ادا کرسکتا ہے۔ یہ وہ بنیادی سوال ہے جو ہم یہاں زیر بحث لا رہے ہیں۔ ملک میں جاری نظام ہائے تعلیم کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کئی طرح کے امتیازات ہیں یہ مسلکی بھی ہیں اور دیگر بھی، لیکن استاد کا بنیادی کردار ایک ہی ہے، وہ جو بھی مضمون پڑھائے وہ یہ پیشِ نظر رکھے کہ وہ کیسے سماج کو اچھے شہری دے سکتا ہے۔ وہ سماج کو ڈاکٹر دے یا انجینئر دے یہ اس کی ذمہ داری ہے مگر ثانوی درجے کی، اس کی جو اولین ذمہ داری ہے وہ یہ کہ وہ سماج کو اچھے شہری دے اور اگر وہ یہ ذمہ داری نہیں ادا کر رہا تو چاہے وہ معاشرے کو اچھے ڈاکٹرز دے رہا ہو یا انجینئرز مگر وہ انصاف نہیں کر رہا۔

ایک روادار اور مذہبی ہم آہنگی رکھنے والے سماج کی تشکیل میں استاد کیا کردار ادا کرسکتا ہے؟ یہاں ایک تنوع ہے یہاں مدارس کے اساتذہ بھی ہیں، جدید تعلیمی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی ہیں۔ ان سب کو جمع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کی خصوصیت تو کوئی علیحدہ ہوسکتی ہے مگر بطور استاد آپ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جدید تعلیمی اداروں اور مدرسے سے نکلنے والے طالب علم سماج کا حصہ بن رہے ہیں اگر وہ اچھے انسان نہیں ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ معاشرے کو کچھ نہیں دے رہے۔ تو پھر وہ سماج کو مذہب کے نام پر دہشت گردی دے گا، فرقہ واریت دے گا، اسی طرح سے اگر ایک ڈاکٹر ایک اچھا انسان نہیں ہے تو وہ معاشرے سے قصائی اور ڈاکٹر کے فرق کو ختم کردے گا۔ قصائی تو حلال جانوروں کی گردن پر چھری رکھے گا یہ انسانوں کی گردن پر چھری رکھے گا۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہر فرد معاشرے کی ضرورت ہے کوئی معاشرہ علماء کے بغیر نہیں چل سکتا۔ کوئی معاشرہ ڈاکٹرز، انجینئرز کے بغیر نہیں چل سکتا، استاد کا فرض ہے کہ وہ جو بھی انسان تیار کریں اس کے اندر بنیادی اخلاقی اقدار ہونی چاہئیں تاکہ وہ معاشرے کا کارآمد پرزہ بن سکیں اور مشین کے اندر سارے پرزے ہم آہنگی کے ساتھ چل رہے ہوں۔ ہم آہنگی سے مراد یہ ہے کہ ہم معاشرتی تنوع اور مذہبی تنوع کو قبول کرتے ہوئے اس کو وجہ نزاع نہ

بننے دیں یہ ہے مذہبی رواداری۔ اختلافِ مذہب غیر فطری نہیں دنیا بھر میں ہوتا ہے۔ رسالت مآب ﷺ کے زمانے میں بھی ایک سے زیادہ مذاہب کے ماننے والے موجود تھے۔ یہ کیوں نہیں ہوا کہ سارے لوگ مسلمان ہوجاتے، اس کا ذکر قرآن میں آیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ساری دنیا کو ایک امت بنا سکتا تھا، یہ ایک الٰہی سکیم ہے کہ لوگوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ جو چاہے مذہب اختیار کریں یہ ان پر چھوڑ دیا گیا۔ نبی کریمؐ سے کہا گیا کہ آپ زبردستی ان کے دین تبدیل نہیں کرائیں گے ان کا معاملہ خدا کے ساتھ آخرت میں ہونے والا ہے۔ دنیا میں مذہبی تنوع الٰہی سکیم ہے۔ جو معاشرے اس کو الٰہی سکیم سمجھ کر اپنے آپ کو اس سے ہم آہنگ بنا لیتے ہیں وہ پرامن ہوجاتے ہیں۔ دنیا میں جہاں انسان نے الٰہی سکیم سے لڑنے کی کوشش کی وہ مشرق ہو یا مغرب ہو اس میں ہمیشہ شکست اس کا مقدر بنی۔ مرد و زن کے تعلقات کے بارے میں ایک الٰہی سکیم ہے، انسان کے جبلی تقاضوں کی تسکین کیلئے ایک الٰہی سکیم ہے۔ جہاں بھی انسان نے اس کو برباد کرنے کی کوشش کی اس کا لازمی نتیجہ فساد کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس طرح خیالات اور مذہب کو اختیار کرنے کے بارے میں بھی ایک الٰہی سکیم ہے اس کو جس نے اختیار کیا وہ ایک پرامن اور روادار معاشرہ تشکیل دینے میں کامیاب ہوگیا۔ جس نے یہ خواہش کی کہ ساری دنیا کے لوگ ایک مذہب پر ہوجائیں اس نے اصل میں الٰہی سکیم کو چیلنج کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ فساد ہے۔

جب ہم مذہبی رواداری کی بات کرتے ہیں تو اصل میں ہم سماجی رویّوں کی بات کر رہے ہوتے ہیں غلط یا صحیح کی بات نہیں کر رہے ہوتے۔ ہم اصل میں سماج کی تشکیل کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ جس میں انسان ایک دوسرے کے احترام کے ساتھ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جس میں امن ہوتا ہے۔

آج سوال یہ ہے کہ ایسے معاشرے کی تشکیل میں استاد کا کردار کیسا ہوسکتا ہے۔ اگر وہ مذہب پڑھا رہا ہے تو وہ مذہب کو کس طرح سماج میں پڑھائے کہ مذہب کی تعلیم حاصل کرنے والا سماج کی ہم آہنگی کیلئے چیلنج نہ بن جائے، چونکہ یہاں پر سارے لوگ اسلامی تعلیمات سے وابستہ ہیں اس لئے ہم اگر اس بات پر توجہ مرکوز کرسکیں کہ وہ جو مذہبی تعلیم دی جارہی ہے وہ مذہب کا کون سا تصور لوگوں کے سامنے رکھ رہی ہے اور اس کے نتیجے میں کیا پیدا ہو رہا ہے؟ کیا وہ تعلیمی مسلکی

طور پر لوگوں کو تقسیم کر رہی ہے۔ کیا وہ تعلیم مذہبی طور پر غیر روادار معاشرہ پیدا کر رہی ہے پھر ہمیں سوچنے کی ضرورت ہے کہ استاد اپنا کردار کیوں نہیں ادا کر سک رہا۔ آج کا سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح کی مذہبی تعلیم دے رہے ہیں اور کس طرح ہم ایک روادار معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ رواداری اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تعلیم غیر جانبدارانہ ہو۔ مجھے جو چیز اپنے طلباء کو سکھانی ہے وہ یہ ہے کہ اگر وہ ہندو ہیں، مسلم ہیں یا عیسائی ہیں تو معاشرے کے اندر انہیں کیسے ایک روادار اور پرامن شہری کے طور پر جینا ہے۔ مقاصد شریعت کی پانچ بنیادی باتیں علماء نے لکھی ہیں۔ ان میں مذہبی آزادی، جان و مال کا تحفظ، عزت و آبرو، یہ ساری چیزیں آپ کے بنیادی مقاصد شریعت کا حصہ ہیں اس لئے ایک روادار معاشرے کی تشکیل ہم سب کی منزل ہونی چاہیے۔

چوتھی نشست

کلیدی خطبات

صدارت: خورشید ندیم (محقق، دانشور و کالم نگار)

مقررین: ڈاکٹر سید جعفر احمد، ڈاکٹر عبدالحمید نیئر

عنوان: پاکستان میں مذہبی و مسلکی تنوع اور مذہبی اداروں کا کردار

مقرر: ڈاکٹر عبدالحمید نیئر (سابق پروفیسر، قائداعظم یونیورسٹی)

پاکستان میں مذہبی و مسلکی تنوع کافی زیادہ ہے۔ ہمارے پاس کہنے کو 95 فیصد مسلمان ہیں مگر 5 فیصد غیر مسلم بھی پاکستانی ہیں۔ اسی طرح بہت سے فرقے ہیں جن کی الگ الگ فقہ ہیں۔ ہر ایک اپنی فقہ کی بالادستی چاہتا ہے۔ ہمارا معاشرہ اس تنوع میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اس کا شکار ہوتا چلا گیا ہے۔ اس میں سے پہلا نشانہ غیر مسلم بنے جو اب کونوں کھدروں میں چھپ چکے ہیں۔ اچانک مسجدوں سے اعلانات ہوتے ہیں اور ہجوم نکل کر بستیاں جلا دیتا ہے۔ وہ بھی اس ملک کے شہری ہیں۔ ہمارے امتیازی سلوک کے باوجود وہ ہمارے ساتھ منسلک ہیں اس پر ہمیں ان کا مشکور ہونا چاہیے۔ میری گفتگو کا پہلا نقطہ استاد کا کردار ہے۔ اس کی بڑی ذمہ داری یہ بھی ہے

کہ سیکھنے والے کو سکھائے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کو علم دے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس میں جستجو پیدا کرے تاکہ آگے جا کر وہ خود علم اکٹھا کرے اور پھر اسے آگے بڑھائے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ نہ صرف یہ کہ طالب علم سوال کریں بلکہ اپنی اپنی دلیلیں بھی دیں۔ اگر ہم اس گُر سے واقف نہیں تو ہم نیا علم دریافت نہیں کر سکتے۔ لیکن مکالمے میں تحمل بہت ضروری ہے۔ میرا دوسرا نقطہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی تاریخ میں جو مسلکی و فقہی اختلافات پیدا ہوئے ہیں ان کی تاریخ کیا ہے۔ میری عمر 72 سال ہے میرے بچپن میں بھی شیعہ سنی فسادات ہوتے تھے لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ محرم میں سنی بھی تعزیئے بنایا کرتے تھے، سبیلیں لگاتے تھے۔ ربیع الاول کو شیعہ بھی ایسا کرتے تھے۔ یہ روادار زمانہ تھا، اس کے بعد فسادات شروع ہوئے تو معمول بن گئے۔ رنجشیں بڑھ گئیں، میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ وہ کون سا ٹرننگ پوائنٹ تھا کہ جہاں پر مسلکی اختلافات فسادات کی شکل اختیار کر گئے۔ 80 کی دہائی میں آپ کے پاس ایک کے بعد ایک علماء قتل ہونا شروع ہوئے۔ علامہ احسان الٰہی شہید اور دیگر نام یہ وہ زمانہ تھا جب ہم نے شریعت کے نفاذ کا علم اٹھایا تھا۔ ضیاء الحق کے دور میں پاکستان میں شریعت کے نفاذ کی باتیں ہو رہی تھیں اور فقہی اختلافات نے سر اٹھایا۔ سپاہ محمد بنی، سپاہ صحابہ بنی وغیرہ وغیرہ۔ ایسے گروہ بنے جنہوں نے مخالف فقہ کے لوگوں کو قتل کرنا اپنے لئے مذہبی فریضہ جانا۔ اس کے بعد سے وہ بنیاد پڑی ہے کہ اس وقت سے ہم میں مذہبی یگانگت کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ یہ چیز بڑھتی رہی پھر جہاد و دہشتگردی آئی اور آہستہ آہستہ ہم تکفیری نظریات تک پہنچ گئے۔ کہنے کو یہ نظریات پرانے ہیں مگر اب یہ نئے انداز سے سامنے آئے ہیں۔ میں صحیح ہوں باقی سب غلط ہیں اور قابل قتل ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ کم ہے مثلاً کئی اسلامی ممالک میں اس کا چلن عام ہو رہا ہے۔

ہمارے ہاں اقلیتوں کا مسئلہ ہے جنہیں آئین نے برابر کے شہری حقوق دیئے ہیں مگر ہم انہیں یہ حق نہیں دیتے ہم ان کو اس جگہ دھکیل رہے ہیں جہاں پر غیر مسلموں کو قومی دھارے سے الگ کیا جا رہا ہے۔

جب یہاں چاروں فقہ کی بات کی گئی اور کہا گیا کہ مدارس میں یہ سارے پڑھانے چاہئیں تو کسی نے نہیں کہا کہ ایک پانچواں فقہ، فقہ جعفریہ بھی تو ہے اسے بھی پڑھایا جائے۔ تیسرا نقطہ یہ

ہے کہ ہم اس ملک میں مذہبی ومسلکی رواداری حاصل نہیں کرسکتے جب تک ہم اپنے نصاب کو اسلامائز کرنے کے جذبے کوٹھنڈا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ پچھلے سیشن میں اس پر بحث ہوچکی ہے مثال کے طور پر ہمارے نصاب کے اندر بعض مذاہب کے بارے میں نفرت کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ وہ جب درسی کتابوں میں اپنے ہی مذہب کے بارے میں ایسی چیزیں پڑھتے ہیں ان کے جذبات کیا ہوتے ہوں گے۔ یہ سوچنے کی چیز ہے ہم جو اکثریت میں ہیں کیا ہمیں اپنی رائے دوسروں پر ٹھونسنے کی بھی آزادی حاصل ہے یا یہ کہ ہمیں اقلیتوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہیے۔

محمد عامر رانا

ڈاکٹر عبدالحمید نیئر نے یہاں دو بڑی اہم باتیں کیں۔ استاد کا یہ مطلب نہیں کہ اس کو ہر چیز کا پتہ ہو۔ استاد اور طالب علم میں فرق یہ ہے کہ استاد میں سیکھنے کی صلاحیت زیادہ ہونی چاہیے۔ ضروری نہیں کہ اس کے پاس ہر سوال کا جواب ہو، وہ طالب علم سے اس لئے آگے ہے کہ اس میں سیکھنے کی جستجو زیادہ ہے۔ دوسرا نقطہ جو بڑا اہم ہے کہ پاکستان کی پوری تحریک محروم طبقوں کی تحریک تھی وہ سمجھتے تھے کہ اکثریت، اقلیت کے حقوق کا تحفظ نہیں کرسکتی اس لئے الگ سے ایک مملکت ہو، پاکستان کے اوپر یہ ذمہ داری زیادہ تھی کہ اس کے اندر جو اقلیتیں ہیں ان کے حقوق کا تحفظ کرے۔ یہ پاکستان کیلئے چیلنج نہیں ہونا چاہیے تھا پاکستان بطور ریاست اور بطور سماج اس مسئلے کو حل کرسکتا تھا لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ وہ ذہنیت اور خاص استبداد جس سے نجات کیلئے اس ملک کو حاصل کیا گیا مگر جب ہم اکثریت میں آئے تو ہم نے انہی استبدادی رویّوں کا اظہار شروع کیا۔ اس کا تعلق ہماری سیاست سے کتنا ہے یہ سوال بھی بار بار اٹھتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا جواب ڈاکٹر سید جعفر احمد کے پاس ہوگا۔

عنوان: پاکستان کا سماجی اور سیاسی منظرنامہ اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا کردار

مقرر: ڈاکٹر سید جعفر احمد (ڈائریکٹر پاکستان سٹڈی سینٹر جامعہ کراچی)

میں جب ڈاکٹریٹ کررہا تھا تو میرے انگریز سپروائزر نے مجھے بڑا اچھا مشورہ دیا تھا اس نے کہا تھا کہ جب بھی کوئی تحقیقی مقالہ لکھو یا کہیں کوئی پریزینٹیشن دو تو اپنے کارڈز شروع میں کھول کے دکھا دیا کرو اس کا مطلب یہ ہے کہ جسے تاش کے کھیل میں پتے چھپا کر رکھے جاتے ہیں مگر مجھ جیسے طالب علموں کیلئے مشورہ یہ ہے کہ اپنے کارڈز شروع میں کھول دو تا کہ دوسروں کو معلوم ہو کہ آپ سے توقع رکھی جائے یا نہیں۔ میرا پہلا کارڈ تو یہ ہے کہ ٹھیک ہے کہ مجھے ایک جامعہ میں پڑھاتے ہوئے 25 سال ہو گئے لیکن میں ایک طالب علم ہوں اور میرے طالب علم ہونے کا ثبوت ہے کہ میں روزانہ اپنے بچوں سے بھی ایسا کچھ سیکھ رہا ہوتا ہوں جو کہ میرے علم میں نہیں ہوتا۔
دوسری بات یہ ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں مذہب مین سٹریم موضوع ہے وہاں کوئی بھی شخص مذہب اور اس کی تعلیمات اور اس کے لٹریچر سے اپنے آپ کو غافل نہیں رکھ سکتا۔ تاریخ اور سیاسیات کا طالب علم ہونے کے ناطے کچھ رسالے میرے مستقل مطالعہ میں رہتے ہیں۔ ترجمان القرآن کا مستقل قاری ہوں۔ میثاق باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ المحدث میرے پاس مستقل آتا ہے، البینات پڑھتا ہوں، البلاغ پڑھتا ہوں اور میں یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ ہمارے مختلف مسالک کی پوزیشن مختلف مسائل پر کیا ہے۔ وہ کن مسائل کو اہمیت دیتے ہیں۔ خاص طور پر ان رسائل میں جو سوالات دریافت کئے جاتے ہیں اور ان کے جوابات پر مجھے ایک رائے بنانے میں مدد ملتی ہے۔ اگرچہ میرا پیرا ڈائم مذہبی نہیں ہے میں بنیادی طور پر سیاسیات کا طالب علم ہوں لہٰذا چیزوں کو دیکھنے کے میرے زاویے بھی سیاسی ہیں۔ آپ اس سے اختلاف کرسکتے ہیں مگر میں نے اپنا پیرا ڈائم سوچا ہوا ہے۔ کارل مارکس کی ایک کتاب یہودی مسئلے کے بارے میں ہے۔ کارل مارکس نے کہا کہ اگر اہل مذہب کی طرف سے کوئی سیاسی دعویٰ کیا جاتا ہے تو یہ موضوع مذہبی نہیں رہتا سیاسی بن جاتا ہے اور اسے سیاست کے دائرے میں رکھ کر دیکھنا چاہیے۔

آج جو کچھ پاکستان میں مذہب کے بارے میں کہا جا رہا ہے میں سب کو سیاسی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کے سماج کو سمجھنے کی کوشش کریں، دوسری چیز یہ کہ ہم پاکستانی ریاست کو دیکھیں۔ بہت ساری گڑ بڑ ریاست اور معاشرے کے اس تعلق کے اندر ہوئی۔ یا تو یہ معاشرہ ریاست کے اوپر منطبق نہیں ہو پاتا یا ریاست معاشرے کے اوپر منطبق

نہیں ہو پا رہی۔ اس تضاد میں وہ قوتیں نکل آئی ہیں جن کو نہ معاشرہ کنٹرول کر پا رہا ہے اور نہ ہی ریاست۔ جہاں تک پاکستانی معاشرے کا تعلق ہے یہ بہت زرخیز اور متنوع ہے۔ ہماری بہت ساری ثقافتیں اور زبانیں ہیں۔ یہ تنوع ہماری قوت کا سبب بن سکتا تھا۔ اگر ہم اس تنوع کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے تو یہ ریاست اور معاشرہ سازی میں بہت اہم ثابت ہو سکتا تھا لیکن پاکستان میں ہوا یہ کہ اس تنوع کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کیا گیا بلکہ اسے دبانے کی بھی کوشش کی گئی۔ ایک بڑا معروف جملہ ہم صبح شام سنتے ہیں کہ ہم پنجابی، بلوچی، پختون یا سندھی نہیں ہیں بلکہ ہم مسلمان اور پاکستانی ہیں۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک اچھا پاکستانی ہونے کیلئے یا ایک اچھا مسلمان ہونے کیلئے مجھے اپنے سندھی ہونے کو کیوں رد کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھ پائے کہ ہر انسان کی کئی شناختیں ہوتی ہیں جو بیک وقت اہمیت کی حامل ہوں۔ میں بیک وقت مسلمان بھی ہوں، پاکستانی بھی ہوں اور سندھی بھی ہوں۔ میں جب یورپ جاتا ہوں تو میری ایک اور شناخت بنتی ہے میں جنوبی ایشیائی بھی بن جاتا ہوں۔ وہاں میں اپنا پاکستانی ہونے کا ذکر بھی نہیں کرتا کیونکہ وہاں بنگالی، سری لنکن میرے سفیر بن جاتے ہیں۔ ہم ان شناختوں کے ساتھ بھی ایک قومی وحدت کا تصور دے سکتے ہیں لیکن ہوا یہ کہ پاکستان میں ریاست سازی کچھ اس انداز سے ہوئی کہ وہ معاشرے کے اس تنوع کو قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ جو حکمرانی کیلئے استعماری ماڈل تھا اور جو فوج اور بیوروکریسی کی بالادستی پر استوار ہوا تھا وہ ہم نے ورثے میں حاصل کیا یہ شدید مرکزیت کا حامل نظام تھا۔ اس شدید مرکزیت کے نظام کو ہم نے پاکستان میں جاری و ساری کیا۔ 9 سال تک ہم گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو سینے سے لگائے رہے۔ وہ ہمارے عبوری آئین کے طور پر کام کرتا رہا۔ اس مرکزیت پسندی کا نتیجہ یہ تھا کہ پہلے دن سے مشرقی بنگال اور ہمارے درمیان دوریاں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ اب اس مرکزیت پسندی کے اور بہت سارے شاخسانے تھے جب ریاست کے اوپر ایک خاص طبقے کی حکمرانی پیدا ہو جائے وہ اپنی مرکزیت پسندی کی سوچ کو نافذ کریں تو پھر ظاہر ہے کہ ایک بہت بڑا مسئلہ ان کیلئے استحقاق کا پیدا ہوتا ہے۔ ہماری ریاست کے پاس وہ استحقاق موجود نہیں تھا۔

پاکستان جمہوریت اور وفاقیت کے نام پر بنا تھا نہ ہم نے جمہوریت قائم کی نہ وفاقیت قائم

کی۔ ہم نے شدید مرکزیت پسندانہ نظام قائم کیا۔ کراچی میں جو اس وقت دارالحکومت تھا وہاں دو حکومتیں تھیں ایک نظر آنے والی اور ایک نظر نہ آنے والی۔ نظر آنے والی حکومت میں کبھی لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، محمد علی بوگرہ، سہروردی اور چند دیگر آتے جاتے رہتے تھے۔ نظر نہ آنے والی حکومت وہ تھی جس میں غلام محمد تھے، چوہدری محمد علی تھے، سکندر مرزا تھے، ایوب خان تھے، اکرام اللہ تھے، سینئر بیوروکریٹس اور فوج کے افسران، ساری پالیسیاں بناتے تھے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کو آبادی کی بنیاد پر حق دینے کی بجائے ان پر ون یونٹ تھوپا کہ 50 فیصد نمائندگی ان کے پاس ہو اور 50 فیصد مغربی پاکستان کے پاس۔ یہ سارے ماڈل مرکزیت کیلئے تھے۔ اب اس پورے نظام کو قانونی شکل کیسے دی گئی۔ اس کیلئے جواز پیدا کرنے کیلئے پہلے پہل اسلام کا نام استعمال کیا گیا۔ ابتداء کے دس گیارہ برسوں میں اس کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ انگریز کے زمانے کا مائنڈ سیٹ چلا آ رہا تھا۔ بیوروکریسی کا وہی اینگلو انڈین مائنڈ سیٹ چلا آ رہا تھا چاہے وہ جسٹس منیر ہوں وہ غلام محمد ہوں یا چوہدری محمد علی ہوں، اس زمانے میں اس بات کی ضرورت زیادہ محسوس نہیں ہوئی کہ مذہب کا نام استعمال کریں یہاں تک کہ 1953ء کی تحریک جو قادیانیوں کے خلاف تھی اس پر جو کمیشن بیٹھا اس کی رپورٹ کے اندر انہوں نے مذہب کا استعمال نہیں کیا بلکہ اہل مذہب کے تضادات کو نمایاں کر کے پیش کیا۔ مذہب کا استعمال اس وقت ہونا شروع ہوا جب ہمارے ہاں صوبائی خودمختاری کی تحریکیں چلیں۔ جب مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ بنا۔ جب مغربی حصے میں اینٹی ون یونٹ فرنٹ بنا۔ جب آزاد پاکستان پارٹی اور جی ایم سید صاحب نے اور غوث بخش بزنجو اور عبدالصمد خان اچکزئی اور جتنے ہماری صوبائی خودمختاری کے دعوے دار تھے انہوں نے جب صوبائی خودمختاری کی بات کرنا شروع کی تو مرکز کی طرف سے اسلام کا نام استعمال کرنے کا فیصلہ ہوا اور اس کی شروعات ایوب خان کے زمانے سے ہو جاتی ہیں۔ تب ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کس طور استعمال ہوا اور پھر وہ ساری تنظیمیں جو ایک زمانے تک پسماندہ رہیں جن کا تحریک پاکستان میں کوئی قابل قدر حصہ نہیں تھا ان تمام تنظیموں کو پاکستان میں زندہ کیا گیا ان کی اہمیت بڑھائی گئی۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ 70 کے عشرے سے یہ رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اب پاکستان کا معاشرہ 1947ء کے معاشرے سے بھی آگے جا چکا ہے۔ بڑی تعداد

میں شہروں میں نقل مکانی ہوئی ہے۔کل کے گاؤں آج کے چھوٹے شہر بن چکے ہیں۔کل کے چھوٹے شہر آج کے بڑے شہر ہیں۔ریاست کی ایک بڑی ناکامی ہے کہ وہ اس نقل مکانی کو ہینڈل نہیں کر پا رہی۔ جو لوگ پنجاب اور خیبر پختونخواہ سے دوسرے علاقوں میں جاتے ہیں ان کی آباد کاری کیلئے ریاست کے پاس نہ تو وسائل ہیں نہ استعداد ہے یا یہ وسائل دوسری جگہوں پر استعمال ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی مدارس نے بچوں کو اپنی جانب راغب کرنا شروع کیا ہے۔اس بات پر کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے کہ دینی مدارس جو خدمت سرانجام دے رہے ہیں یہ وہ کام تھے جو ریاست کو کرنے چاہئیں۔ایک سوشل ویلفیئر سٹیٹ یہی کرتی ہے کہ وہ ان شہریوں کو جو وسائل نہیں رکھتے ان کو مکان دیتی ہے، کپڑا دیتی ہے اور تعلیم دیتی ہے۔دینی مدارس یہی کر رہے ہیں وہ بچوں کو سائبان دیتے ہیں، خوراک دیتے ہیں، کپڑا دیتے ہیں۔ وہ غریب آدمی جس کے 11 بچے ہیں وہ انہیں کیوں نہ دینی مدارس میں بھیجے۔سو دینی مدارس میں اگر بچوں کی تعداد لاکھوں میں ہے تو یہ کوئی ناقابل فہم بات نہیں ہے۔ ہاں اگر ریاست ان لوگوں کی ذمہ داریاں ادا کرتی اور پھر یہ رجحان ہوتا تو پھر ہم اسے دوسرے انداز سے دیکھتے۔

شہروں کے اندر ایک اور بڑا مسئلہ ہے۔کراچی کو دیکھیں تو کہا جاتا تھا کہ شہروں کے اندر مختلف ثقافتوں کے لوگ آتے ہیں، گھل مل جاتے ہیں۔ان کا انجذاب ہو جاتا ہے لیکن اگر شہروں میں بڑی تعداد میں لوگ باہر سے آنا شروع ہو جائیں تو پھر وہ جذب نہیں ہوتے۔آپ توقع نہ رکھیں کہ اگر 25 لاکھ پختون کراچی آتے ہیں تو وہ کراچی میں جذب ہو جائیں گے۔ایسا ہو نہیں سکتا وہ پھر اپنے محلے اور اپنے باڑے بنا کر رہیں گے۔آپ پاکستانیوں کو لندن میں جا کر دیکھیں یہ کیوں نہیں وہاں پر جذب ہوگئے کیوں ایسا ہے کہ پرسٹن کے پاکستانی الگ نظر آتے ہیں اور ساؤتھ آل کے الگ۔ یہ کیوں نہیں انگریزوں میں جذب ہوگئے۔ جب بڑی تعداد میں ہجرت ہوتی ہے تو پھر انجذاب نہیں ہوتا۔ وہاں دوسرے اصول کو پیش نظر رکھنا ہوگا جو تکثیریت کا ہے کہ آپ قبول کریں کہ یہاں پر اتنے لاکھ پختون ہیں، اتنے پنجابی ہیں اور اتنے اردو بولنے والے ہیں۔ان سب کو اگر یہاں رہنا ہے تو کون سی شرائط کے تحت یہ رہ سکتے ہیں اگر کوئی معیشت میں حصہ ڈال رہا ہے تو کل وہ سیاست میں بھی حصہ مانگیں گے۔ دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی

آبادی دوسرے شہر میں آ کر صرف خدمت کرتی ہے۔ایک نسل یا دوسری نسل کے بعد وہ اپنا حصہ بھی مانگتے ہیں۔آج کیوں برطانوی پارلیمنٹ میں 45-40 جنوبی ایشیائی نظر آتے ہیں۔اس لئے کہ ان کی پہلی نسل نے سیاسی جگہ نہیں مانگی۔وہ کان کنی کرتے رہے، ملوں میں کام کرتے رہے، پھر دوسری نسل آ گئی تو اس نے کہا کہ اب ہمیں سیاسی حقوق بھی چاہئیں۔ جب معاشرے میں تکثیریت ہوتی ہے تو دوسروں کو سیاسی جگہ دینی چاہیے۔پاکستانی ریاست میں ابھی تک یہ صلاحیت نہیں کہ وہ کسی اقلیت کو حقوق دے سکے۔ریاست ان کی آبادکاری نہیں کرا سکتی یہ ریاست کا کام ہے کہ وہ کراچی میں آبادکاری کرائے۔صوبائی اسمبلیوں کی حد بندیاں ہوں۔اس بات کا یقین کیا جائے کہ سب نسلی و لسانی اقلیتوں کے لوگ اسمبلیوں کے اندر پہنچیں۔ کیوں ایسا ہے کہ کراچی کی نشستوں پر کبھی کبھار کوئی اکا دکا پختون آ جاتا ہے جبکہ وہ یہاں پر 25 لاکھ کی تعداد میں ہیں پھر ان کی نمائندگی صوبائی اسمبلی میں کیوں نہیں ہے۔اس لئے کہ آپ کی صوبائی اسمبلیوں کی حلقہ بندیاں اس بنیاد پر ہوئی ہیں کہ کس طبقے کو فائدہ پہنچانا ہے اور کس کو نہیں پہنچانا۔ یہ ریاست کا کام ہے کہ چیزوں کو سیٹل کروائے جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر لوگ اپنے انکلیو بنا کر رہتے ہیں۔لوگ اپنی شناختوں اور ماضی کے تعلق کی بنیاد پر سیاست کرتے ہیں۔ چنانچہ مجھے حیرت نہیں ہوتی کہ ہمارے شہروں میں وہ کاسمو پولیٹن کلچر نہیں بن رہا جو تاریخ میں ہم نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں بنتے دیکھا۔ یورپ میں بھی لوگوں نے شہروں میں ہجرت کی تھی تو وہاں ایک صنعتی معاشرے کا کلچر بنا تھا۔ پاکستان کے شہر، رورل کلچر کی ایکسٹینشن ہیں۔آپ لاہور میں جا کر پنجاب کے رورل کلچر کی تصویر دیکھ رہے ہوں گے۔آپ کراچی میں آ کر خیبر پختونخوا کے رورل کلچر کی تصویر دیکھ رہے ہوں گے۔ کراچی کی اپنی کوئی تصویر نہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ جب لوگ اپنے ماضی اور شناختوں کی طرف جاتے ہیں تو ایسے موقعوں پر ایک ایسا عنصر سامنے آتا ہے جو لوگوں کو مذہبی سیاست کی طرف لے کر جاتا ہے۔ یہاں پر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ذرا سوچیں کہ مذہب کا بنیادی مقصد کیا ہے۔تقابل ادیان یا مذاہب کی تاریخ دیکھیں تو دو رجحان نظر آتے ہیں ایک یہ کہ مذہب معاشرہ سازی کا کام کرتا ہے وہ معاشرے کی تعمیر کرتا ہے اور کچھ لوگوں کا اصرار ہے کہ مذہب کا کام ریاست سازی ہے۔اس پر کئی مباحث ہیں۔ایک مصنف نے بڑی دلچسپ بات

لکھی اس نے کہا کہ اگر تمام مذاہب کا کام ریاست سازی ہوتا تو انبیائے کرام بادشاہ ہوتے۔ لیکن جن چند انبیاء کو ہم جانتے ہیں ان میں سے چند ایک نے ریاست سازی کی۔ چند ہیں جو سیاسی اقتدار پر بھی فائز ہوئے، باقی انبیاء نے معاشرہ سازی کی، دونوں ماڈلز ہمارے سامنے ہیں۔ ریاست کا بھی ہے اور معاشرہ سازی کا بھی ہے۔

ہمارے ہاں بھی ایک طویل عرصے تک یہ سوچ کارفرما رہی ہے کہ اگر معاشرہ مذہبی بنتا ہے تو اس معاشرے کے جو سیاسی ادارے ہیں ان کے اندر بھی لامحالہ وہ قدریں جھلکیں گی جو اس معاشرے کی قدریں ہیں۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ کیا معاشرے کی اصلاح پہلے کریں یا پھر ریاستی اقتدار پر قبضہ کر کے مذہب کا اطلاق معاشرے پر کریں۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میری سوچ یہ ہے کہ آج یورپ میں مذہب بہت مضبوط ہے۔ ہم لوگ یورپ کو دوسری عینک سے دیکھتے ہیں لیکن اگر وہاں جا کر رہیں تو آپ کو وہاں کی اقدار کی سطح پر بھی اخلاقی قدریں بہت مضبوط نظر آئیں گی۔ ٹھیک ہے کہ ان کی نوجوان نسل شاید مذہبی نہ ہو لیکن کسی اتوار کے روز اگر جرمنی میں چرچ کے باہر کھڑے ہوں، آسٹریا میں کھڑے ہوں یا برطانیہ میں تو آپ کو ہزاروں لوگ عبادت کیلئے جاتے ہوئے نظر آئیں گے۔ وہاں احترام آدمیت بھی ہے خدمت خلق بھی ہے۔

وہ جانوروں کے حقوق کا بھی خیال رکھتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی حکومتیں بہت زیادہ منافق ہیں۔ وہ امریکہ ہو، برطانیہ ہو یا فرانس ہو، یہ دنیا کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتے ہیں لیکن اپنے ملک میں انہی قدروں کے پابند ہیں۔ ہمارے ہاں یہ سوال بہت اہم ہے کہ ہم مذہب کے اطلاق کے ضمن میں کیا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ 20 ویں صدی کے آغاز تک ہمارے ہاں یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ 20 ویں صدی کے آغاز پر مختلف بین الاقوامی حالات میں یہ صورتحال بنی کہ ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی بھی شامل تھے جنہوں نے اسلام کو ایک سیاسی مذہب کے طور پر پیش کرنا شروع کیا۔ ابوالکلام آزاد تو ایک حد تک آگے گئے ان کے پیش نظر ہندوستان کی تقسیم یا عدم تقسیم کے معاملات تھے۔ سیاسی اسلام، مولانا مودودی کا ایک بہت بڑا فریم آف ریفرنس بنا۔ ان کی فکر کا محور ایک اسلامی ریاست کا تصور تھا۔ یہ اسلامی ریاست بنیادی طور پر اس وقت قائم ہو سکتی تھی جب

صالح لوگوں کی تنظیم یہ بیڑہ اٹھائے۔ انہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت بھی اس لئے کی کیونکہ ان کی دانست میں قائداعظم محمد علی جناح اسلام کا نام تو لے رہے تھے مگر نہ تو وہ خود اور نہ ہی ان کی ٹیم کے لوگ وہ صالح لوگ تھے جو اسلامی ریاست قائم کر سکتے تھے۔ مولانا مودودی نے ایک بڑی بنیادی بات کی کہ جن لوگوں کیلئے جناح صاحب پاکستان بنا رہے ہیں وہ تو سب کے سب نسلی مسلمان ہیں یہ عقلی مسلمان تو نہیں ہیں۔ مولانا مودودی کو جو شک تھا وہی جناح صاحب کا مدعا تھا۔ شک انہیں یہ تھا کہ یہ جو ملک بنائیں گے یہ ایک نیشن سٹیٹ بن جائے گا۔ وہی جناح صاحب چاہتے بھی تھے۔ جناح صاحب صرف مسلمانوں کیلئے یہ ملک نہیں بنا رہے تھے وہ سب کیلئے ملک بنا رہے تھے، مسلم لیگ کا نعرہ تھا کہ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں ہے۔ اس میں ایوب کھوڑو بھی آ گئے اور پیر صاحب مانکی شریف بھی آ گئے اور قیوم خان اور دولتانہ بھی آ گئے۔ مولانا مودودی کو جس بات پر اعتراض تھا جناح صاحب کر وہی رہے تھے۔ مودودی صاحب نے بہت کھل کر مخالفت کی انہوں نے کہا کہ مجھے اس بات پر غرض نہیں کہ پاکستان کے اندر کون کون شامل ہوگا۔ وہ مسلمان بھی شامل ہوگا جو چور ہے۔ ان سب پر مشتمل آپ جو ملک بنا رہے ہیں، میں اسے اسلامی ریاست نہیں مانوں گا۔ وہ مسلمانوں کی قومی ریاست ہوگی اور قائداعظم مسلمانوں کی قومی ریاست ہی بنا رہے تھے۔ جب پاکستان بنا تو اس کے بعد قائداعظم نے اپنا کارڈ کھول دیا اور 11 اگست کی تقریر میں انہوں نے کیا کہا، وہ دو قومی نظریے کی بنیاد پر اپنا مقدمہ لڑ رہے تھے اور 11 اگست کو وہ فرما رہے ہیں کہ آج کے بعد نہ مسلمان مسلمان ہے، نہ ہندو ہندو ہے، بلکہ سب پاکستان کے برابر کے شہری ہیں۔ دو قومی نظریہ انہوں نے لپیٹ کر ایک طرف رکھا جس سے یہ پتہ چلا کہ دو قومی نظریہ تقسیم ہند سے پہلے قائداعظم کیلئے کوئی آرٹیکل آف فیتھ نہیں تھا۔ ایک پولیٹیکل ایڈوائس تھی ایک طریقہ تھا مسلمانوں کی اجتماعیت قائم کرنے کا تا کہ ہندوؤں کے مقابلے پر وہ اپنے مطالبات منوا سکیں۔

مسلمانوں کی ایک الگ شناخت کیلئے اور ان کا الگ پلیٹ فارم بنانے کیلئے یہ ضروری تھا کہ مسلمان اپنی مذہبی اور ثقافتی شناخت کی بنیاد پر وہ چیز حاصل کریں جو بصورت دیگر انہیں حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ جب انہوں نے کہا کہ ہم الگ قوم ہیں ہم اقلیت نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ

قائداعظم 1927ء سے مطالبہ کرتے چلے آ رہے تھے کہ مسلمانوں کو 33 فیصد نمائندگی مرکز میں دو۔ کیوں مسلمان تو ہندوستان میں 24 فیصد تھے، وہ کیوں 33 فیصد مانگ رہے تھے صرف اس لئے کہ آپ ہمیں اقلیت نہ کہئے۔ ہم قوم ہیں۔ مسلم قومیت کا جو نعرہ انہوں نے بلند کیا اس کا ایک سیاسی مقصد تھا کہ ہندوستان میں اگر ہم متحدہ ہندوستانی قومیت کی طرح رہتے ہیں تو ہم تھوڑے سے اوپر اٹھیں۔ اپنی عددی حیثیت سے بلند تر ہو کر بڑھیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح عورتیں جب انتخاب لڑ سکتی ہیں تو پھر آپ نے پارلیمنٹ میں ان کیلئے 16 فیصد الگ نشستیں کیوں رکھی ہوئی ہیں۔ صرف اس لئے کہ مردوں کے معاشرے میں عورتوں کیلئے اپنی نمائندگی آسان نہیں ہے اس لئے وہ انتخابات میں اگر نشستیں جیت سکتی ہیں تو جیت لیں اس کے علاوہ انہیں 16 فیصد نشستیں اور دی گئی ہیں کیوں کہ یہ ہماری آبادی کا 51 فیصد ہیں۔ یہ اقراری عمل ہے یہی ایکشن جناح صاحب مسلمانوں کیلئے چاہ رہے تھے جب انہوں نے کہا کہ ہم ایک قوم ہیں جب کانگریس کی جانب سے ان کے مطالبات نہیں مانے گئے تو بالآخر تقسیم ہند پر نوبت پہنچی۔ اب 11 اگست کو جناح صاحب یہ تقریر کر رہے ہیں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے اقلیتوں کے دل جیتنے اور بلووں کو روکنے کیلئے یہ تقریر کی۔ لیکن اگر آپ یہ تقریر پڑھیں تو اس میں جناح کا پورا فلسفہ موجود ہے۔ وہ یہ بتا رہے تھے کہ ماضی میں ان کا مئوقف کیوں تھا اور آج ان کا مئوقف کیوں ہے۔

اس تقریر میں انہوں نے کہا کہ ماضی میں ہمیں یہ اندیشہ تھا کہ ہندو اپنی اکثریت کی بنیاد پر مستقل اکثریت بن جائیں گے اور ہم مستقل اقلیت، اس بات پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں تھا، اعتراض تھا ان کی پارلیمنٹ میں اکثریت بننے پر، اس لئے ہم نے یہ ساری تجاویز دیں کہ مسلمانوں کو ان کی تعداد سے زیادہ نمائندگی دی جائے۔ تب قائداعظم نے کہا کہ بتائیں اب پاکستان میں ہم کیا کریں کیا پھر ہم دوقومی نظریہ شروع کریں۔ جب پاکستان بنا تو مشرقی پاکستان سمیت یہاں پر 14 فیصد ہندو موجود تھے۔ کل کو وہ کہہ سکتے تھے کہ صاحب اسی دوقومی نظریے کے تحت ہمیں الگ کر دیجئے۔ ہم تو اپنا وطن بنا رہے ہیں۔ اس کی بنیاد پر قائداعظم نے کہا کہ ہم پاکستان کے اندر ایسی ریاست بنائیں گے جو اقلیت اور اکثریت کے اوپر یقین ہی نہیں رکھے گی اور یہ تبھی ہوگا جب ہم ریاست کو غیر جانبدار بنائیں۔ لوگ اپنے اپنے مسلک اور مذہب پر

چلیں۔ میں یہ عرض کروں کہ دنیا میں کوئی ایسی سیکولر سٹیٹ نہیں ہے جو لوگوں کو مذہب پر چلنے سے روکتی ہو اگر ایسا ہوتا تو آج امریکہ میں دس بارہ ہزار مساجد نہ ہوتیں اور اگر ایسا ہوتا تو آج برطانیہ میں مدارس کو لوکل کونسل کی طرف سے گرانٹ نہ مل رہی ہوتی۔ برطانیہ میں تو ہمیں اتنی سہولتیں میسر ہیں کہ جیل کے قیدیوں نے کہا کہ ہم یہاں 12-15 قیدی ہیں ہم جمعے کی نماز کسی امام کے پیچھے پڑھنا چاہتے ہیں اور ہم میں سے کوئی اس لائق نہیں ہے کہ وہ امامت کرے، چنانچہ لوکل کونسل نے فیصلہ کیا کہ ان صاحب کیلئے دوسری کاؤنٹی سے ایک امام صاحب جائیں گے جو جیل میں جا کر جمعے کی امامت کروایا کریں گے۔ برطانیہ میں سکولوں میں والدین نے کہا کہ ہماری بچیاں فراک پہنتی ہیں وہ سکرٹس نہیں پہن سکتیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی ٹانگیں بھی کور ہوں۔ لوکل کونسل نے سکول کو حکم دیا کہ آپ ایسا کریں۔ اس کا مطلب ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ اگر وہ سیکولر ریاستیں ہیں تو وہاں مذہب کی پریکٹس کرنا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید برطانیہ اور امریکا میں جو مسلمان ہیں ان کی اسلام کے ساتھ وابستگی کہیں زیادہ مضبوط ہے۔

اس ساری صورتحال میں اس میں کیوں ہمارے ہاں مذہبی انتہا پسندی پھیلی۔ ریاست نے ان ساری چیزوں کو کیسے فروغ دیا کس طرح وہ تنظیمیں بنائی گئیں جن کو اسلحہ بھی دیا گیا۔ انہوں نے پہلے افغانستان میں اور جب افغانستان کا باب بند ہوا تو پھر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حساب کتاب کیا۔ کس طرح ان تنظیموں کے اندر کرپشن آئی۔ یہ میں نہیں کہہ رہا، قاضی حسین احمد صاحب کی یادداشتیں جسارت کے میگزین کے اندر شائع ہو چکی ہیں۔ قاضی حسین احمد بتا رہے ہیں کہ پہلے پہل جب حکمت یار اور یونس خالص پاکستان آئے تو ان کو ٹھہرانے کیلئے ہمارے پاس حجرے نہیں تھے اور بامشکل ہم نے ان لوگوں کو ٹھہرایا بعد میں یہ پی سی میں ٹھہرنا شروع ہوئے اور جو کلچر انہیں ملا اس پر بہت سی چیزیں کھل کر سامنے آئیں پھر وہ خود یہ بتاتے ہیں کہ وہ وقت بھی آیا جب افغانستان میں ان جہادی تنظیموں نے آپس میں جھگڑے کئے تو پاکستان سے یہ لوگ وفد لے کر گئے۔ قاضی صاحب، خورشید احمد، سراج الحق گئے۔ یہ ایوان صدر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ربانی صاحب صدر تھے اور حکمت یار کو یہ تک پتہ تھا کہ یہ لوگ دو پہر دو بجے تک ایوان صدر میں ہوں گے اب دو بجے کے بعد یہ لوگ پاکستان کیلئے نکل جائیں گے۔ ان کی روانگی مئوخر ہوگئی

جس کا حکمت یار کو پتہ نہیں تھا انہوں نے بمباری شروع کروادی۔ یہ لوگ بمشکل ایوان صدر سے نکل کر آئے۔ پھر ان تنظیموں نے اپنے اپنے ایجنڈے بنانے شروع کئے یہ جو تشدد ہے اس کی اپنی ایک پولیٹیکل اکانومی ہے ایسا نہیں ہے کہ کہیں سے پیسہ نہیں آرہا۔ اتنی بڑی تعداد میں اسلحہ آیا کہ اعداد وشمار یہ بتاتے ہیں کہ کراچی میں جو اسلحہ موجود ہے وہ کراچی کی آبادی سے زیادہ ہے۔ کہاں سے یہ اسلحہ سمگل ہو کر گھر پر پہنچتا ہے ایک پورا نظام ہے۔ اس کا پیسہ کہاں سے آرہا ہے کیا ریاست کو یہ سب کچھ نظر نہیں آتا۔ برائے مہربانی علما اور سیکولر کلاس کے مابین ہونے والی اس لڑائی کو لڑائی نہ سمجھیں۔ یہ ریاست وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی رٹ کھوتی چلی جارہی ہے صرف مذہبی تنظیمیں اور انتہا پسند اسے چیلنج نہیں کر رہے۔ لیاری کے گینگ وار بھی کر رہے ہیں اور شہروں کے اندر مافیا بھی چیلنج کر رہے ہیں۔ ہمیں اس ریاست کو دوبارہ سے بنانا ہوگا۔ یہ کام ہمیں معاشرے کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر کرنا ہوگا یہ نہ ہو کہ کوئی غلام محمد صاحب آکر ہمیں بتائیں ایوب خان آکر ہمیں بتائیں۔ اس کا فیصلہ لوگوں کو کرنے دیں۔ جب ان کے اتفاق رائے سے کچھ سامنے آئے گا تو وہی ریاست یہاں پر چلے گی۔

سوالات

سوال: امریکہ، بھارت، اسرائیل کے نصاب میں اپنے قومی مفاد کو اجاگر کیا گیا ہے اسرائیل کے نصاب میں عربوں کی تحقیر کی باتیں کی جاتی ہیں تو پھر ہم کیوں اپنا نصاب تبدیل کریں؟

سوال: ڈاکٹر سید جعفر صاحب سے سوال ہے کہ کیا دو چار دس واقعات کی بنیاد پر پورے فریم ورک کو تبدیل کیا جا سکتا ہے یعنی دین کی جگہ سیکولرازم لایا جا سکتا ہے۔

سوال: ایک ہے نفس شریعت دوسرا مطلب شریعت اور تیسرا ہے گروہوں کی شریعت، نفس شریعت کے بارے میں تو اللہ نے قرآن میں کہا کہ ہر ایک امت کو عطا کی، نفس شریعت سے انکار عقل سے ماورا ہے۔ ہم شریعت کے نفاذ کے لئے جمہوریت کی طرف کیوں نہیں دیکھتے، اگر اکثریت فیصلہ کرلے تو کیا اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔

جوابات:

ڈاکٹر عبدالحمید نیئر

اگر ریاست مضبوط ہوتی تو تفرقے وقت پر ختم ہو جاتے، یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا میں اگر فرقے ہیں بھی تو وہ ایک دوسرے کی جان کے درپے نہیں اس لئے کہ ریاست اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔

اسرائیل کی مثال درست نہیں، وہ پاکستان کی طرح مذہبی ریاست ہے، اس لئے وہاں بھی دوسرے مذاہب کے بارے میں منافرت پائی جاتی ہے۔

ہمیں جو بات نظر آتی ہے وہ بالکل گروہوں کی شریعت ہے اب نفس شریعت کہاں چھپی ہوئی ہے ہمیں نظر نہیں آتی۔

جوابات:

ڈاکٹر سید جعفر احمد

ہمارے ہاں سیکولرازم کا غلط تصور پایا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے اپنی ڈکشنری میں اس کا ترجمہ بھی بڑا غلط کیا۔ انہوں نے سیکولرازم کو لادینیت قرار دیا۔ نہ اس لفظ کے موجد کے پیش نظر یہ بات تھی نہ سیکولر معاشروں میں لادینیت ہوتی ہے۔ سیکولرازم کا آسان ترین مطلب یہ ہے کہ دنیا داری کی چیزیں۔ یہ لفظ اس طرح نکلا کہ یورپ میں قرونِ وسطیٰ میں بہت بڑی بڑی زمینیں چرچ کے پاس ہوتی تھیں۔ ان کی کوئی حد ختم ہی نہیں ہوتی تھی وہ عیسائیت کے نام پر ان زمینوں پر قابض تھے جو دور افتادہ زمین بچ جاتی تھی اس کو کہتے تھے کہ یہ سیکولر زمین ہے۔ سیکولر کا مطلب تھا دنیا داری جس کا پس منظر یہی تھا۔

اب اگر بلب ایجاد ہوا تو اس میں نہ چرچ کا کردار تھا نہ مذہبی، انہوں نے کہا کہ یہ بلب سیکولر ہے۔ قوانین حرکت دریافت ہوئے تو کہا گیا کہ یہ سیکولر ہیں، جتنی سائنسی ایجادات ہوتی چلی گئیں وہ سب سیکولر قرار پائیں۔ سیکولر کا مطلب ہے وہ چیزیں جو براہ راست طور پر مذہب سے تعلق نہیں رکھتیں جن صاحب نے پہلے پہل یہ لفظ ایجاد کیا ان کا نام ہیلوک تھا۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ جب میں سیکولرازم کی بات کرتا ہوں تو میں دنیاوی بات کر رہا ہوتا ہوں۔ وہ چیزیں جو

چرچ کے دائرے سے باہر ہیں انہوں نے یہاں تک کہا کہ اس دنیا کے علاوہ بھی کچھ حقائق ہو سکتے ہیں جو ان پر یقین رکھنا چاہتا ہے رکھے لیکن میں صرف ان چیزوں کو جانتا مانتا ہوں جو چیزیں میرے تجربے میں ہیں جن کو میں چھو سکتا ہوں یا دیکھ سکتا ہوں۔ وہ جو حیات بعد الممات کا تصور ہے اس کو بھی چیلنج نہیں کر رہا۔ یہ سیکولرازم کا تصور ان معنوں میں ہے۔ اگر ریاست غیر جانبدار ہو تو لوگوں کو اپنی شریعت پر چلنے دے۔ جس کا جو مسلک اور فقہ ہے وہ چلیں۔ کوئی حقیقی سیکولر ریاست کسی مذہب پر حد قائم نہیں کرے گی، اسے روکے گی نہیں۔ اب آپ کا یہ فرمانا کہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے اور دین میں سب کچھ ہوتا ہے۔ اس تناظر میں آپ کسی عیسائی سے جا کر بات کریں تو وہ بھی یہی کہے گا کہ ہمارا مذہب بھی مذہب نہیں دین ہے۔ ہمارے پاس بھی سارے اصول ہیں جن سے ریاست سازی ہو سکتی ہے۔

ہمارا مدعا ایک بااخلاق، صالح معاشرہ قائم کرنا ہے اس کیلئے آپ معاشرے سے شروعات کرتے ہیں یا ریاست سے شروع کرتے ہیں۔ جب ریاست سے شروع کرتے ہیں تو جمہوریت کی بات ہوتی ہے اکثریت کی بات ہوتی ہے، مسئلہ یہ ہے کہ جمہوریت صرف اکثریت کا نام ہے۔ جمہوریت اکثریت پر ہی حد قائم کرتی ہے۔ جمہوریت کا تصور ہی فرد کی آزادی اور حقائق سے شروع ہوا ہے آپ کے آئین میں 8 سے 28 آرٹیکلز تک جو بنیادی حقوق دیئے گئے ہیں اس میں درج ہے۔ جہاں ایک طرف یہ کہا گیا کہ اسلام ریاست کا مذہب ہوگا تو وہاں یہ بھی درج ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے اور اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے اور اپنے مذہب کی تشہیر کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ میری آزادی وہاں ختم ہوتی ہے جہاں سے آپ کی آزادی شروع ہوتی ہے۔ آپ اپنے مسلک اور شریعت پر چلیں لیکن اگر اس سے دوسرے کی آزادی متاثر ہونے کا خدشہ ہے تو یہ آزادی کوئی نہیں دے گا۔

صدارتی خطبہ

خورشید ندیم

مولانا مودودی نے ایک جملہ استعمال کیا تھا کہ کچھ لوگ بیچ کی راہ کے لوگ ہوتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ میں بھی بیچ کی راہ کا آدمی ہوں۔ جن ذی علم لوگوں نے یہاں بات کی ان کے احترام کے ساتھ ان سے جزوی اتفاق کرتا ہوں۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو دوسرا مکتبہ فکر یہاں موجود ہے اس سے بھی اتفاق کرتا ہوں۔ میرے نزدیک اصل راستہ درمیان میں کہیں ہے اور ہمیں وہ راستہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان بنیادی طور پر مسلمانوں کا ملک تھا یا بنا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب بطور حوالہ کے ہم اسے قبول کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ مسلمان کسی خاص نسل کا نہیں ایک خاص مذہب کے ماننے والوں کا نام ہے۔ مسئلہ یہ ہوا کہ جو مقدمہ یہاں ہر مذہب کو سامنے رکھتے ہوئے پیش کیا گیا اور جس کی ضرورت کو علامہ اقبال نے محسوس کیا تھا اس کا پاکستان میں کوئی والی وارث نہیں رہا۔ ہمارے ہاں جب پاکستان بن گیا اور کہا گیا کہ یہ اسلام کے نام پر بنا ہے تو اس کا ناگزیر نتیجہ یہ نکالا گیا کہ اس کو ایک اسلامی ریاست بنانا ہے۔ اس وقت ہمارے پاس اسلامی ریاست کا جو بیانیہ تھا وہ وہی تھا جو مولانا مودودی پیش کر رہے تھے۔ ریاست پاکستان کے پاس اسلام کا کوئی بیانیہ سرے سے موجود نہیں تھا۔ علامہ اقبال کو اس کا احساس تھا اس کی طرف انہوں نے اپنے خطبات میں توجہ دلائی تھی کہ جب ایک جدید اسلامی ریاست بننے جا رہی ہے تو اس کے فکری و مذہبی چیلنجز کیا ہیں؟ چنانچہ وہی شریعت کی ابدی صورت ہے جس کو آپ فقہ کہتے ہیں اس کی تشکیل نو کی ضرورت پر انہوں نے اصرار کیا۔ پاکستان کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ علامہ اقبال کی اس فکر کا کوئی وارث پیدا نہیں ہوا۔ چنانچہ اسلام کے نام پر ریاست بنانے میں اور اس کے بعد اس کو چلانے میں جو خلاء تھا اس کو اس بیانیے نے پُر کیا جو مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پیش کر رہے تھے۔ چنانچہ پاکستان اور اسلام کے تعلق کی بحث کوئی دس بارہ سال پرانی نہیں بلکہ یہ بالکل ابتداء میں ہی پیدا ہو گئی تھی۔ قرارداد مقاصد مارچ 1949ء میں منظور ہوئی اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اور ریاست کے باہمی تعلق کی بحث بہت ابتداء میں ہی موجود تھی۔ جب یہ قرارداد مقاصد منظور ہوئی تو لیاقت علی خان کی اسمبلی میں جو تقریر ہے وہ خود یہ بیان کر رہی ہے کہ یہ بنیادی بیانیہ، مذہبی جماعتوں کا دیا ہوا نہیں تھا بلکہ خود مسلم لیگ کا دیا ہوا تھا۔ مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ آپ کے پاس اس کی کوئی عملی صورت موجود نہیں تھی وہ جماعت اسلامی کے پاس ہی تھی۔ ایوب خان نے پوری کوشش کی کہ اس کو ایک نیشن سٹیٹ کے طور پر لے کر جائے۔ ہمارے

علم میں ہے کہ مذہبی جماعتیں ایوب خان کے مخالف تھیں۔ ریاست کا نام اسلامیہ جمہوریہ پاکستان ایوب خان نے نہیں رکھا تھا۔اس لئے ریاست نے تو اس کو مجبوراً اختیار کیا کیونکہ ایک تاریخ کا دباؤ تھا جو اس پر موجود تھا اور وہ اس سے انحراف نہیں کر سکتی تھی۔ مذہب یہاں کبھی انتشار کا باعث نہیں بنا، مذہب انتشار کا باعث 1979ء کے بعد بنا۔ دو بڑے واقعات اس کا سبب بنے ،ایک ایران کا انقلاب اور دوسرا افغانستان میں روس کی آمد۔ان دو واقعات کے بعد ریاست نے جب قومی سلامتی کی تکمیل کیلئے مذہب کو ایجنڈے میں شامل کیا تو اس وقت مسئلہ پیدا ہوا۔

1973ء کا آئین ایک سیکولر حکمران نے دیا۔ پاکستان کی ریاست کو اسلام سے منسوب کرنا ایک سیکولر نظریات رکھنے والی جماعت کا فیصلہ تھا۔اس طرح گلبدین حکمت یار کو سب سے پہلے قاضی صاحب بھٹو کے پاس لے کر گئے تھے۔ چونکہ داؤد کے دور میں جس طرح کی مشکلات افغانستان سے پاکستان کو پیش آرہی تھیں اس کا جواب بھٹو صاحب دینا چاہتے تھے اس وقت گلبدین حکمت یار اور یونس خالص وغیرہ آئے۔

اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا مودودی جو سیاسی اسلام کے بانیوں میں سے ہیں وہ ریاستی ڈھانچے کے بغیر کسی جہاد کے کبھی قائل نہیں رہے۔1948ء میں جب کشمیر کا جہاد ہو رہا تھا تب بھی مولانا مودودی نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔گلبدین کو بھٹو صاحب کے پاس لے جانے کا مشورہ بھی قاضی حسین احمد کو مولانا مودودی نے دیا تھا۔اس لئے کہ یہ اقدام جماعت اسلامی نہیں لے سکتی تھی۔ یہ اقدام ریاست پاکستان ہی لے سکتی تھی۔ جہاد ریاست کے بغیر بھی ہوسکتا ہے یہ بیانیہ 1979ء کے بعد پیدا ہوا۔اس وقت اس بیانیے کو لے کر چلنے والا کوئی جید عالم پاکستان میں موجود نہیں تھا۔ضیاء الحق نے یہ قدم اٹھایا، ریاست نے یہ بیانیہ قبول کیا اور بنایا۔اس کے بعد کا معاملہ آپ کے سامنے ہے۔مسئلہ یہ ہوا کہ مذہب کی بنیاد پر ریاست نے کشمیر سے افغانستان تک سیکورٹی کا ایک پورا پیراڈائم تخلیق کیا۔ مذہب کا اصل کردار معاشرے کی اخلاقیات سنوارنا ہے۔ یہ وہ کام تھا جو مذہب نے نہیں کیا۔ سیاست کے اندر تشدد کمیونزم لے کر آیا۔ یہ پولیٹیکل اسلام لے کر نہیں آیا۔آپ ماؤ کو پڑھیں یا مارکس کو وہ بتاتے ہیں کہ انقلاب خون کے بغیر آ ہی نہیں سکتا۔20 ویں صدی کی اسلامی تحریکیں بھی کمیونسٹ پارٹی سے متاثر ہوئیں۔ یہ دور ازم کا تھا۔کیپٹل

ازم،سوشلزم تو اس کے مقابلے پر اسلام کو بھی ایک نظام بنا کر پیش کیا گیا۔ چنانچہ جو چیز کمیونزم سے وابستہ تھی وہ اسلام کے ساتھ بھی وابستہ ہونے لگی۔ مذہب اپنے جوہر میں کہیں بھی پر تشدد نہیں تھا۔اس وقت انقلاب کے سارے ماڈل تشدد پر مبنی تھے اس لئے لوگوں نے اس کو اختیار کر لیا۔میرا تجزیہ ہے کہ اگر مذہب کو سماج سے وابستہ کر لیں تو یہ اخلاقیات پر زور دے گا اور اس کو ریاست سے وابستہ کر لیں تو یہ پولیٹیکل آرڈر کی تشکیل میں معاون ہوگا۔اس کے نتیجے میں لازماً وہی کچھ ہوگا جو اس وقت ہم دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ پاکستان میں مذہب کے نئے احیاء کی ضرورت ہے۔سماج نظام اقدار پر چلتا ہے، ریاست قانون کی بنیاد پر چلتی ہے۔جب آپ مذہب کو ریاست کے ساتھ منسلک کرتے ہیں تو وہ ایک قانون کی شکل اختیار کرتا ہے۔اس لئے مذہب کو ریاست کی بجائے سماج کے ساتھ منضبط کرنے کی ضرورت ہے تا کہ سماج کی اخلاقی طاقت بڑھے۔تاریخ میں مذہب سے بڑی کوئی طاقت نہیں رہی۔ جب میں مذہب کی بات کرتا ہوں تو صرف اسلام کی نہیں بلکہ مسیحیت کی اور یہودیت کی بات بھی کر رہا ہوتا ہوں۔ کیونکہ جو سچا مسلمان ہو یا مسیحی ہو تو اس کے سماجی کردار میں جوہری طور پر کوئی فرق نہیں ہوگا وہ اپنے وجود میں خیر کی علامت ہوگا۔

دوسرا دن

پہلی نشست: عدم برداشت اور شدت پسندی

صدارت: ڈاکٹر خالدہ غوث

سابق ڈائریکٹر سینٹر آف ایکسیلینس فار ویمن، چیئرپرسن پاکستان سینٹر فار ڈیموکریسی اسٹڈیز کراچی یونیورسٹی)

مقررین: ڈاکٹر قبلہ ایاز، محمد عامر رانا

عنوان: عدم برداشت، سماجی ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ

مقرر: ڈاکٹر قبلہ ایاز

معاشرے کے قیام کی بنیادی غرض و غایت امن،قبولیت اور بقائے باہمی مقصود

ہیں۔لوگ ایک دوسرے سے بہتر تعلقات سے رہیں۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے اجتماعی کوشش کی جائے اگر کوئی چیز اس سلسلے میں رکاوٹ ہوتو بہتر طریقے سے ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ جب ہم مذہبی حوالے سے دیکھتے ہیں تو پہلی مثال ہابیل وقابیل کی ہے۔اس میں قرآن نے وضاحت کے ساتھ کہا کہ اللہ تعالیٰ کو امن مطلوب ہے جارحیت نہیں۔

اللہ نے قابیل کیلئے ناپسندیدگی کے الفاظ استعمال کیے۔رہتی تاریخ تک ہابیل ہی انسانوں کا آئیڈیل بنا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک لمبے عرصے تک ہابیل کے نام سے اس کی پرستش کی جاتی رہی۔اس کے بعد انبیائے کرام نے ہمیشہ سماجی ہم آہنگی، برداشت، امن اور قبولیت کی طرف لے کر جانے کی کوشش کی۔ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کے درمیان حسد کی صورتحال پیدا ہوتی ہے تو حضرت یعقوبؑ کے ہاں استقلال، صبر اور اللہ تعالیٰ کے ہاں رجوع کا ثبوت ملتا ہے پھر حضرت یوسفؑ بھی ایک مثالی بھائی کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ جب وہ وزیر خوراک بنتے ہیں تو قحط سالی میں سب کے وقار کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے خوراک دی جاتی ہے۔اس کے بعد جب بنی اسرائیل پر مظالم ہوئے تو حضرت موسیٰؑ کا کردار ایک مثالی صورت میں سامنے آتا ہے تو عدم تشدد سے بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات ملی۔ پھر حضرت سلیمانؑ کے دور میں صنعتی ترقی ہوئی۔ملکہ صبا نے کہا کہ امن ہی ہماری ترجیح ہے۔یہ سب واقعات سماجی آہنگی کا پتہ دیتے ہیں۔جس معاشرے میں یہ ہوتو وہاں تسخیر کائنات ہوتی ہے۔ وہاں علوم کی ترقی ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعائے امن اور سورۃ قریش کا واقعہ یہ سب سماجی ہم آہنگی کیلئے ہیں۔ریاست کا اس میں کردار اہم ہے اگر ریاست ابہام کا شکار ہوتو مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوسکتے لیکن ریاست کے ساتھ ہم نے معاشرے کے کردار کو بالکل نظر انداز کردیا ہے۔ پاکستان میں ہم سب ریاست کے حوالے سے تو بات کرتے ہیں مگر معاشرے کے حوالے سے نہیں کرتے۔جن قوموں نے ریاست کے ساتھ معاشرے پر زور دیا۔انہوں نے ترقی کی۔ہمیں یہودیوں سے سیکھنا چاہیے وہ بخت نصر کے دور سے لے کر ہٹلر تک ہمیشہ زیرِعتاب رہے لیکن انہوں نے معاشرے میں کبھی بھی سماجی ہم آہنگی کو نظر انداز نہیں کیا۔آج وہ تعلیم یافتہ ہیں، مالدار ہیں۔

ہم عدم برداشت کے دور سے گزر رہے ہیں ہم مسلکی تفریق کا شکار ہیں۔ڈیرہ اسماعیل

خان میں ایک نیا گروپ بڑا ایشو بنا ہوا ہے۔ وہ پتھری گروپ ہے وہ کہتے ہیں کہ قبروں پر نہیں جانا، جنازے کے بعد دعا نہیں ہونی چاہیے۔ان پر علمی گفتگو ہونی چاہیے لیکن آپ نے اس کا نام ہی پتھری گروپ رکھا کہ اس میں کوئی لچک نہیں ہے۔ہم نسلی اور قومیت کی بنیاد پر بھی عدم برداشت کا شکار ہیں حالانکہ اگر ہم محرومیت کے حوالے سے دیکھیں تو جس طرح بلوچستان کا ایک عام بلوچ محروم ہے جس طرح کے پی کے، کے کوہستان کا ایک پختون محروم ہے یہی صورتحال اندرون پنجاب میں بھی ہے۔اس کو قومیت کا رنگ دینا نامناسب ہے۔اب یہ جو تکفیری سلسلہ چلا ہے کہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو بارود سے اڑانا، یہ عدم برداشت کی آخری حد ہے کہ ہم کسی مخالف عقیدے کو زندہ رہنے کا بھی حق نہیں دیتے۔

تحریک پاکستان کے جو مخالف سوچ تھی وہ یہ تھی کہ صدیوں سے ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ رہے ہیں اور وہ مزید بھی ساتھ ساتھ رہ سکتے ہیں، ہم اقلیت واکثریت کے تصور کو قبول کر کے انتظامی حوالے سے کوئی ایسا انتظام کرسکتے ہیں کہ الگ ملک نہ بنے۔اس سوچ کے پیچھے اس وقت کے جید علمائے کرام تھے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دین میں اس بات کی گنجائش موجود ہے۔ہمیں عدم برداشت کی بجائے باہمی قبولیت کی طرف جانا چاہیے۔ہم ایک دوسرے کو قبول کرلیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی کہ کسی کو شیعہ پیدا کیا کسی کو سنی پیدا کیا، کسی کو ہندو پیدا کیا اور کسی کو عیسائی۔اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کیلئے یہ ممکن تھا کہ سب کو ایک رنگ اور عقیدے میں پیدا فرماتے۔ یہ تنوع خوبصورتی ہے۔اگر آج ہم اپنے معاشرے میں یہ بات تسلیم کرلیں تو بہتر معاشرہ پیدا ہوگا۔

عنوان: پاکستان میں شدت پسندی کے رجحانات

مقرر: محمد عامر رانا

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری میں ایک چھوٹا سا چیلنج شدت پسندی کا بھی ہے یا شاید جو چیلنج درپیش ہے یہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ردعمل ہے۔اگر اس کو علمی یا سیاسی حوالے کے طور پر دیکھا جائے تو یہ کوئی منفی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں ہوتا۔عرفِ عام کے طور پر جب

شدت پسندی کی بات کی جاتی ہے تو اس کا ایک تناظر ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ یہ ایک الگ اور غیر جانبدار قسم کا عمل ہے جو ہر معاشرے کے اندر کسی نہ کسی سطح پر جاری رہتا ہے۔ وہ معاشرہ خواہ مشرق کا ہو یا مغرب کا، ترقی یافتہ ہو یا پسماندہ ہو، یہ عمل عمر کے کسی خاص حصے میں یا کسی خاص سیاسی حالات میں زیادہ ہوسکتا ہے۔ خاص سماجی، ثقافتی پس منظر میں بھی یہ عمل تیز ہوسکتا ہے بعض اوقات مختلف ریاستوں کے باہمی تعلقات میں کچھ ایسا ہوسکتا ہے کہ معاشرتی سطح پر یہ عمل شروع ہو جائے۔ بنیادی طور پر یہ عمل اگر چلتا رہے تو اس کا زیادہ تر اظہار منفی ہو جاتا ہے اس لئے ریاست اور معاشرہ کوشش کرتے ہیں کہ اس عمل کی ساتھ ساتھ تزئین ہوتی رہے۔ ریاست سماجی ادارے کیوں تشکیل دیتی ہے یہ جو یونیورسٹیاں یا مدارس ہیں، یہ ادارے کیوں ہیں، یا یہ جو سیاسی جماعتیں ہیں، یہ ادارے تہذیب کیلئے ہوتے ہیں تا کہ انسانی جذبات کی تہذیب ہوتی رہے۔ اگر حالات حد سے باہر نکل جائیں تو شدت پسندی کی ایک بھیانک شکل تشدد بھی ہے۔ اس کا انحصار خاص وقت، خاص سیاسی سماجی حالات کے اندر ہے کہ وہ کسی گروہ پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

شدت پسندی کی کوئی الگ سے تعریف کرنا خاصا مشکل ہے۔ جو معاشرے ان مسائل سے دوچار ہوان کیلئے ان کی تعریف کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ باہر سے جو لوگ ہیں شاید وہ بہتر طریقے سے بتا سکیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مثلاً مسلم سماج کے بارے میں چھ قسم کی رائے پائی جاتی ہیں۔ مغرب کے اندر بھی الگ رائے ہیں۔ غربت، عدم مساوات، معاشی ابتری، ناانصافی یہ سب بھی عدم برداشت کی وجہ ہوسکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ لوگ کہیں اس کی وجہ مذہبی بھی ہوسکتی ہے، کچھ لوگ کہیں کہ مذہب تو اخلاقیات کا درس دیتا ہے وہ شدت پسندی کی کیسے تعلیم دے سکتا ہے۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ اس کی وجہ سیاسی ہے، امریکا کا حملہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ کچھ گروہ جو معاشرے سے الگ ہو جاتے ہیں ان کا ایک سٹیٹ آف مائنڈ ہے۔ کچھ علاقوں میں اگر سماجی یا معاشی اشاریئے بدترین ہو جائیں تو شاید وہاں پر بھی یہ مسئلہ زیادہ ہو جائے۔ پچھلے دس پندرہ سال کے اندر شدت پسندی پر بہت کام ہوا ہے۔ پاکستان کے اندر عدم مساوات کو شدت پسندی کی وجہ قرار دیا جاتا ہے کہ جب شدت پسندی شروع ہو جائے تو یہ اس کو بڑھاوا دیتی ہے۔ اگر فاٹا کے اندر انسانی ترقی کے شماریے حوصلہ افزا نہیں تو یہ صورتحال افریقہ کے

کئی ممالک میں بھی ہے۔ پاکستان کے اندر بھی کئی علاقے اس سے زیادہ پسماندہ ہوسکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف یہ وجہ نہیں ہوسکتی البتہ اگر کوئی شدت پسند تحریک ان علاقوں میں ہو تو اس پسماندگی سے اس کو مدد مل سکتی ہے۔ کیا مذہب اس کی وجہ ہے لیکن یہ بھی ثابت نہیں ہوسکا۔ ایک اور فیکٹر بھی ہے کہ کچھ لوگ اس کو کسی خاص رو میں اختیار کر لیں۔ دراصل پاکستان اور دیگر مسلم معاشروں میں یہ ایک سیاسی عمل ہے۔ بنیادی طور پر سیاست بھی شدت پسندی کے رجحانات کو بڑھاوا دیتی ہے۔ کیا سیاسی عمل کے ذریعے اس کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے کیونکہ اس پورے کے پورے عمل کو جو سیاسی عمل کی وجہ سے شروع ہوا اس کو ایک مذہبی گروہ ٹرانسفارم کر دیتا ہے۔ اس کی مثالیں یمن، شام، پاکستان ہیں جہاں ہر جگہ ایک سیاسی ماحول میں یہ عمل شروع ہوا۔ مگر یہ سیاسی طریقے سے حل نہیں ہو پا رہا شاید مذہبی اجتماعیت کے اداروں میں کمی ہے۔

شدت پسندی کی تین سطحیں بنتی ہیں۔ پاکستان میں بھی اور باقی دنیا میں بھی۔ ہمارے ہاں کم آمدنی والے جو طبقات ہیں ان کے اندر بھی شدت پسندی ہے اس کی وجوہات بھی مختلف ہیں اور اس کا اظہار بھی مختلف ہے۔ مڈل کلاس کیلئے الگ اور اپر مڈل کلاس کا بھی الگ۔ مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ فاٹا کے اندر شدت پسندی میں کس سماجی پس منظر کے لوگ ہیں یا یہ کہ فرقہ وارانہ رجحانات کی ایک تنظیم میں کس قسم کے سماجی یا معاشی پس منظر رکھنے والے لوگ ہیں تو آپ کہیں گے کہ کم آمدنی والے لوگ ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں چونکہ ایک غریب آدمی کا تعلیمی معیار اور اس کا مذہبی علم اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی بھی رائے کو جو ایک مذہبی آدمی دے رہا ہے اس کو دیکھ سکے اور پرکھ سکے یا پھر اس کی رائے کا موازنہ کسی دوسری رائے کے ساتھ کر سکے۔ مڈل کلاس رائے سازی میں جلدی نہیں کرتی۔ مڈل کلاسز کے اندر جو لڑکے سہراب گوٹھ کے سانحہ میں پکڑے گئے یہ معاملہ بھی بڑا دلچسپ قسم کا ہوتا ہے۔ ایک پورا مطالعہ ہے، ان کا کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہوتا نہ وہ سیاسی طور پر متحرک ہوتے ہیں۔ جو لوگ مغرب میں جا کر پاکستانیوں یا مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو ایک خاص قسم کا رجحان سامنے آتا ہے۔ یورپ کے اندر خاص طور پر مسلمانوں کو قبول تو کیا گیا مگر ان کا انجذاب نہیں ہوسکا جس کی وجہ سے وہ اپنے محلے بنا کر رہنا شروع ہو گئے۔ اس قسم کی

تنہائی یہاں کے بالا طبقات میں بھی پائی جاتی ہے۔ پاکستان کے سماجی منظر نامے میں بھی ان کی جڑت نہیں ہوتی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ شدت کے رجحانات ایک خاص سطح پر رہتے ہیں مگر ریاست یا اس کے ادارے کوشش نہیں کرتے کہ اس کو روک سکیں۔

تین ممالک کے اندر شدت پسندی خاصی کم ہے۔ پاکستان، ترکی اور انڈونیشیا میں دہشتگردی کی مخالفت زیادہ ہے۔ یہ بات پیو، گیلپ کے سروے میں آتی ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان جیسے معاشروں میں تو تشدد بہت زیادہ ہے اگرچہ دہشتگردی کے خلاف ہماری رائے 81 سے 85 فیصد رہی ہے یا باقی مسلم معاشروں میں جہاں پر دہشتگردی نہیں ہے وہاں پر القاعدہ یا اسامہ بن لادن کے بارے میں خیالات زیادہ تر حمایتی ہیں اور یہ 50 فیصد سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے، جہاں پر شدت پسندوں کو پسند کرنے کے رجحانات ہیں پر ایسی تنظیمیں نہیں ہیں جو جذبات کو شہ دے کر ایک اجتماعیت کے اندر لے آئیں۔ تشدد کی جو پوری حرکیات ہیں اس کے ساتھ جوڑ دیں۔ پاکستان کے ساتھ ہمیشہ مسئلہ یہ رہا ہے کہ یہاں پر ایسے گروہوں کو کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جو شدت پسندی کے عمل کو اور زیادہ تیز کرتے ہیں ابھارتے ہیں۔ جس کے بعد جو تنازعہ پیدا ہوتا ہے اس کی ایک الگ سے معیشت وجود میں آنا شروع ہو جاتی ہے۔

مسئلے کا آغاز سیاست سے ہوتا ہے لیکن اس کے بعد مذہبی جماعتیں یا گروہ جو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب حالات ان کے کنٹرول سے بھی باہر ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کے اندر کشمیر یا افغانستان میں جو تنظیمیں کام کر رہی تھیں ان کو جب روکنے کی کوشش کی گئی تو یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں بلکہ نئے رجحانات سامنے آ گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ پر تشدد ہو جاتی ہیں تو پھر معاشرے یا ریاست کیلئے کنٹرول بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ملائیشیا، یمن، مصر، سعودی عرب ہر جگہ کوشش ہوئی کہ اس کو روکا جائے۔ اس کیلئے کئی اصطلاحات بھی ہیں۔ کچھ اقدامات سماج کی اور کچھ حکومت کی سطح پر لینے پڑیں گے۔ کہیں پر علماء اور کہیں پر میڈیا کو استعمال کرنا پڑے گا۔ اس عمل کو دو سطحوں پر ہم روک سکتے ہیں۔ ایک سماجی سطح پر ایک ریاستی سطح پر۔ دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل نہ ہو۔ ہر مرحلے پر اس سے نکلنے کا طریقہ موجود ہوتا ہے۔ بعض دفعہ ریاست اور معاشرے کے اندر ایسے دروازے بنانے پڑتے ہیں جہاں

سے وہ خارج ہو جائیں۔ امریکا یا بھارت جو کچھ کر رہے ہیں اس پر کئی سوالات پیدا ہو سکتے ہیں مگر اس سے نکلنے کا حل کیا ہے۔

جب مذہبی معاملات ایک خاص نہج پر پہنچ جائیں تو ذمہ داری بہر حال مذہبی طبقے کی ہے۔ ہمارے علم میں ہے کہ مصر کی جیلوں کے اندر ایک سلسلہ چلا تھا جب وہاں الجہاد اور جمعیت الاسلامیہ کے لوگوں کے درمیان خط و کتابت ہوئی۔ امام الشریف جو القاعدہ کے منشور کے بانی تھے اس کی اور ایمن الظواہری کی خط و کتابت بھی بڑی اہم ہے۔ یہ لوگ جو 1980 کی دہائی میں ہونے والے تشدد میں شامل رہے انہوں نے ایک دوسرے سے خط و کتابت کی کہ کیا ہمارے رویّے کا کوئی جواز تھا، کیا اس سے ہماری تحریک کو یا مصر کو یا عالم اسلام کو اس کا کوئی فائدہ ہوا؟ اس سوال پر بہت لمبی خط و کتابت آپس میں چلتی رہی۔ 17 سال کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمارا جو تشدد کا طریقہ کار تھا وہ نہ تو مذہبی طور پر سود مند تھا بلکہ اس سے ہماری تحریک کو بھی نقصان ہوا اس سے مصر کو بھی نقصان پہنچا جب عرب بہار شروع ہوئی تو اس سے پہلے یہ بحث ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ عرب بہار کے دوران تمام لوگ چاہے وہ دائیں بازو کے تھے یا بائیں بازو کے جب وہ تحریر سکوائر میں حسنی مبارک کے خلاف اکٹھے تھے تو سب سے بڑا خطرہ جو مغرب میں محسوس کیا جا رہا تھا کہ کہیں کوئی القاعدہ جیسے پر تشدد گروہ اس تحریک کو ہائی جیک نہ کر لیں۔ ایک مکالمہ ہادی کی حکومت میں یمن کے اندر بھی ہوا۔ جسٹس عطار کا مکالمہ، یہ ایک ناکام تجربہ ہے، مصر کے اندر جو مکالمہ ہوا وہ کامیاب تجربہ ہے۔ جسٹس عطار نے کہا کہ اس خاص رجحان کے لوگوں کے ساتھ وہ مکالمہ کریں گے وہ مختلف رجحان کے گروہوں کو بلاتے اور مکالمہ کرتے تھے جو کئی کئی دن جاری رہتا تھا۔ اس مکالمے کے نتیجے میں ایک خاص سماجی ہم آہنگی آئی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ یمن اور ہمارے معاشرے کی بہت ساری مطابقتیں ہیں۔ جب مکالمہ شروع ہوا تو انہوں نے اپنی رائے پر از سر نو غور شروع کیا۔ اگرچہ یہ ناکام ہوا مگر اس کا ایک مثبت پہلو بھی ہے کہ تمام کے تمام بحران میں یمن کے اندر نئے تکفیری رجحانات کو پنپنے کی جگہ نہیں مل سکی۔ یہ اس مکالمے کا سب سے بڑا فائدہ ہوا اس کا مطلب ہے کہ مکالمے اور دانشوروں کی گفتگو کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ یہ عمل نہ صرف شدت پسندی کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ ایک ایگزٹ بھی فراہم کرتا ہے اور بہت سارے رجحانات کو ختم

کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

سوالات:

1- عامر رانا صاحب نے جن رجحانات کا تذکرہ کیا اس پر ڈاکٹر سلیمہ اسلم نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ مرد حضرات بیٹیوں کا تو بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں لیکن لڑکوں پر کوئی نگرانی نہیں کرتے۔ وہ آگے جا کر بے راہ روی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ مزید شدت پسندی کی طرف بھی مائل ہو سکتے ہیں جیسا کہ آپ نے صفورہ والے واقعے کا ذکر کیا۔ 9/11 میں تو پی ایچ ڈی ڈاکٹر بھی شامل تھا۔ والدین کا کردار بڑا اہم ہے کہ وہ اپنے بچوں پر نظر رکھیں۔

2۔ ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب سے یہ کہنا چاہوں گا آپ نے جو مذہبی تاریخ بیان کی، ہم جس مذہب کو جانتے ہیں وہ بالکل مختلف ہے مگر یہاں جو کہا گیا کہ شدت پسندی کا خمیر مذہب سے اٹھا ہوا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ ہمارے ساتھ کیا المیہ ہوا کہ مذہب جو اپنی پوری روایت میں امن کا پیامبر رہا اس کی شکل یہ بن گئی کہ ہم لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر ہم اس سے بچنا چاہتے ہیں تو مذہب سے نجات ہی اس کی ایک صورت ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

خورشید ندیم صاحب نے بہت علمی سوال اٹھایا۔ جب آپ کوئی قانون بناتے ہیں تو ماہرین کی ایک مشہور ڈکشن ہے کہ All Clauses are to be read together یعنی تمام کلاز کو یکجا کر کے پڑھنا چاہیے اور اس کے بعد نتیجہ اخذ کرنا چاہیے۔ ہمارے خیال میں اس وقت ہماری پوزیشن یہ ہے کہ ہم تمام کلاز کو یکجا کر کے نہیں پڑھتے اور کچھ کلاز جو کہ ہمارے فائدے کیلئے ہیں ان کو زیادہ اجاگر کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ماضی پر نظر دوڑائیں تو جو پورا بیانیہ بنا ہے اس کا تعلق ایک لحاظ سے گوری قوموں کی جو استعماریت ہے مثلاً پرتگالی آئے، پھر ڈچ آئے، فرانسیسی آئے، انگریز آئے۔ اس علاقے میں استعماریت کے خلاف پہلی مسلح تحریک علماء کے ہاتھ میں تھی۔ مثلاً یاغستان کی تحریک جو اس وقت قبائلی علاقہ ہے اس میں تمام مزاحمتی لوگ

دینی لوگ تھے۔ تاریخ میں ان کے نام پیش نہیں کیے جاتے فقیر اپی، ملا یاوندا، حاجی ترک زئی، یہ سب لوگ مذہبی تھے۔ پھر ریشمی رومال تحریک جس میں شیخ الہند مولانا محمد حسن، مولانا عبیداللہ سندھی یہ سب دینی لوگ تھے لیکن اس کے بعد جو صورتحال بنی اس کو پوری طرح نہ تو ہمارے نصاب کا حصہ بنایا گیا نہ ہمارے علمی حلقوں نے کوئی زیادہ اہمیت دی یہ تمام لوگ پر امن تحریک کی طرف آ گئے انہوں نے 1920 میں فیصلہ کیا کہ مسلح تحریکوں کا راستہ مفید نہیں ہے اور ان کے جانے سے پہلے مولانا آزاد نے کہا کہ آپ نہ جائیں تو بہتر ہوگا لیکن وہ گئے اور ظاہری طور پر ایک ناکام تجربہ تو ہوا جس سے انہیں معلوم ہوا کہ برطانوی استعمار سے نجات ممکن نہیں ہے اس لئے بہتر وقت کا انتظار کریں۔ چنانچہ یہ بہتر وقت جنگ عظیم دوم کے بعد از خود سامنے آ گیا۔ پھر ان کی کل ہند اجتماعیت ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ وہی کامیابی کی ضمانت بنی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے نصاب کا حصہ نہیں ہے اس بات پر زور نہیں دیا جا رہا کہ جب مسلح تحریکات اپنا مقصد حاصل نہ کر سکیں تو پھر خالصتاً دستوری اور آئینی تحریکیں زیادہ موثر ثابت ہوگئیں۔ فلسطین اور اسرائیل کی کشمکش پہلے قومیت کی بنیاد پر تھی۔ بعد میں جب اس میں مذہبی رنگ حماس کی صورت میں آ گیا تو اس نے اس بیانیے کو تقویت دی۔ اس سے پہلے اخوان المسلمون کا مذہبی حوالہ تھا پھر یہاں پر کشمیر اور افغانستان کا جہاد شروع ہوا تو اس میں اہم کردار نبراسکا یونیورسٹی کے نصاب کا تھا اور یہ لوگ آج بھی موجود ہیں جو اس نصاب سے متاثر ہوئے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک نئے یا متبادل بیانیہ کیلئے کوششیں جاری رکھی جائیں تو بہتر صورتحال سامنے آئے گی۔

سوالات

سوال: میرا سوال ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب سے ہے، آپ نے کہا کہ 1920ء کی مسلح تحریکوں کا نقصان ہوا اس کے بعد آپ نے کشمیر کا ذکر کیا کہ جب وہ قومی تحریکیں تھیں تو درست تھیں لیکن جب ان پر مذہبی رنگ چڑھا تو نقصان ہوا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اگر کشمیر یا فلسطین کی تحریکوں پر مذہبی رنگ نہ چڑھتا تو کیا آج کشمیر یا فلسطین آزاد ہو جاتا یا افغانستان کے حالات بہتر ہوتے۔

جواب: یہ نقصان والے الفاظ تو میرے نہیں ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ الفاظ کے استعمال میں بہت محتاط رہوں۔ میں نے شاید یہ کہا تھا کہ زیادہ مئوثر نہیں تھیں ان کے مقابلے پر جو آئینی یا دستوری تحریکیں تھیں۔ ذاتی طور پر اب بھی میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اگر ان تحریکوں کو قومی تحریک رکھا جاتا اور مذہب یا اسلام کے نفاذ کی بات مقصد حاصل کرنے کے بعد بات کی جاتی تو شاید وہ زیادہ مئوثر ثابت ہوتیں۔ مثلاً جب تک حماس کی تحریک نہیں تھی اس وقت تک فلسطین کو عالمی فورمز پر بڑی سپورٹ حاصل تھی۔ بش اوّل کے دور میں امریکی یونیورسٹیوں کو پابند کیا گیا کہ فلسطین کے مسئلے پر وہ اپنی تحقیق قومی مفاد کو سامنے رکھ کر کریں۔ یہ اشارہ تھا کہ فلسطین کے حق میں جو تحقیق ہو رہی ہے وہ نہیں ہونی چاہیے۔ حماس سے پہلے اسرائیل منتیں کر رہا تھا کہ ہمارے درمیان مصالحت کی کوئی صورت پیدا کی جائے مذاکرات کریں لیکن اب فلسطینی آپس میں لڑنا شروع ہو گئے ہیں اور اب آپ دیکھتے ہیں کہ فلسطین کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جانے کیلئے آپ کو اسرائیلی اجازت درکار ہوتی ہے۔ اب ہم نے اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ حماس سے پہلے فلسطین کی تحریک کہاں تھی اور اب اس کے بعد کہاں ہے۔ اسی طرح کشمیر کے حوالے سے دیکھیں کہ پہلے اسلامی دنیا اور باہر بھی ہماری حمایت تھی۔ اس وقت اگر ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو قریبی دوست ممالک بھی محفلوں میں ہمیں کہتے ہیں کہ کشمیر کے مسئلے کو بھول جاؤ۔ اس لئے ہمیں عالمی حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

محمد عامر رانا:

میں ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب کی بات میں اضافہ کرنا چاہوں گا کہ یہ جو ریاستوں کا طریقہ رہا کہ اپنے جغرافیائی مفادات کے لئے مذہب کو اور مذہبی تنظیموں کو استعمال کیا جائے، تاکہ نیشنل پیراڈائم کے اندر اس مقصد کو حاصل کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ لیکن یہ اتنا آسان مسئلہ نہیں ہے جب آپ مذہبی ایکٹرز کو آزادی دیتے ہیں فلسطین سے لے کر پاکستان تک، ظاہر ہے کہ ایک خاص وقت تک تو تعاون جاری رہتا ہے اس کے بعد وہ پہلے نیشنل ازم کو اور پھر ریاست کو چیلنج کرنا

شروع کر دیتے ہیں۔ ہمیں اس کا تجربہ پاکستان میں ہے۔ ریاست مذہب کو کنٹرول نہیں کرسکتی لیکن جب وہ مذہبی جذبات کو اپنے جغرافیائی مقاصد کے حصول میں استعمال کرنا چاہتی ہے تو یہ وہ کمزور پہلو ہوتا ہے کیونکہ مذہب کے اوپر اس کی اجارہ داری نہیں ہوتی اس پر اجارہ داری مذہبی طبقے کی ہوتی ہے وہ ریاست سے اپنے آپ کو الگ کرنا شروع کرتے ہیں اور پھر چیلنج کرنا شروع کرتے ہیں۔ اگر آپ اس کو صرف ایک سائیکل کی صورت میں دیکھیں گے مثلاً حرکت الجہاد اسلامی ایک چھوٹا سا گروپ تھا ابھی جو یہ خراسانی گروپ ہے اور اس کی کچھ شاخیں دولت اسلامیہ کے ساتھ شامل ہوگئی ہیں۔ یہ گروپ کب ریاست کے ہاتھ سے نکلا، کب اس نے علاقائی گروپوں کے ساتھ ساز باز شروع کی، کب وہ بین الاقوامی ہوگیا تو یہ چیزیں آپ کی قومی تحریکوں کیلئے Counter Productive ہو جاتی ہیں۔ یہ تجربہ مختلف علاقوں میں دہرایا جا رہا ہے، اس کو شام میں دہرایا گیا، اس کو لیبیا کے اندر دہرانے کی کوشش کی گئی۔ بار بار اس کا تجربہ ہوا اور ہر بار ناکام ہوا، اب یہ یاد رکھیئے کہ حالیہ تاریخ کی 215 بغاوتیں ہیں اس کے اندر سے صرف ایسی 16 پرتشدد تحریکیں تھیں کہ ان کے ساتھ ریاستیں مزاکرات پر مجبور ہوئیں وہ بھی افریقہ کے اندر چند مثالیں ہیں۔ حالیہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی تحریک نے تشدد کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرلیا ہو۔ 100 سے زیادہ تحریکوں کو ریاستوں نے کچل دیا یا پھر ریاست نے سیاسی طریقے سے ان کو ختم کیا۔

رائے: ڈاکٹر قبلہ ایاز کی بات کی تائید کرتے ہوئے ایک دو باتوں کا اضافہ کرنا چاہوں گا، بدقسمتی سے جن تحریکوں کو ہم نے مذہبی سمجھ لیا وہ مذہبی نہیں تھیں صرف کشمیر کی تحریکوں کو دیکھ لیں۔ جو نبی کریم ﷺ کا جہاد کا طریقہ کار ہے اس میں جو شرائط ہیں ان تحریکوں نے جہاد کا وہ نہج اختیار نہیں کیا۔ ان کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے ان تحریکوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے لیکن یہ مذہبی نہیں ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحمید نیئر:

جب آزادی کی تحریکوں میں مذہب شامل ہو جاتا ہے تو اس کے کیا نتائج نکلتے ہیں اس پر

اچھی باتیں ہوئیں تاہم ایک نقطہ رہ گیا۔ دونوں طرف کشمیر اور فلسطین کی تحریکوں میں وہ صادق آتا ہے وہ یہ کہ آزادی کی تحریکوں کے اندر کئی مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ فلسطین میں خاص طور پر وہاں پر یہودی فلسطینی تھے وہ اور خاص طور پر عیسائی فلسطینی سب شد و مد سے شامل تھے جب اسلامی تحریکوں نے وہاں جا کر جدوجہد شروع کی تو ان لوگوں کو دھچکا پہنچا اور اس وجہ سے تحریک کو نقصان ہوا، بالکل اسی طرح جب 80 کی دہائی کے وسط میں کشمیر کی آزادی کی تحریک شدت اختیار کر گئی تھی اس وقت تک ہم ان ہندوؤں سے بھی کشمیر کی آزادی کی باتیں سنتے تھے جو وہاں یونیورسٹیوں میں پڑھایا کرتے تھے لیکن جب اس تحریک کو اسلامی انقلاب کے طور پر لیا گیا تو پھر وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔

ڈاکٹر معروف بن رؤف:

میری ناقص رائے میں کوئی بھی مذہبی شدت پسندی کا دعویٰ نہیں کرتا، بالکل اسی طرح اگر کوئی ڈاکٹر کسی کا غلط آپریشن کرے گا تو ہم میڈیکل کو نہیں بلکہ ڈاکٹر کو غلط کہیں گے لیکن یہاں پر جو گفتگو ہوئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہاں مذہب کو غلط کہا جا رہا ہے۔ اس وقت دنیا میں ہر جگہ مسلمان پس رہا ہے۔ چیچنیا میں کمیونسٹوں نے مارا، برما میں بدھوں نے مارا، انڈیا اور بھارت کے اندر ہندو مار رہے ہیں۔ اسرائیل کے اندر یہودی مار رہے ہیں۔ اس پوری کیفیت کے اندر ہم اسلام کو کیوں نہیں دیکھ رہے۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

میں نے تمام حوالے قرآن وسنت اور پیغمبروں کے دیئے کہ سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کے مطلوب رویّے کون سے ہیں۔ باقی ہم نے اس حوالے سے کہا کہ کشمیر اور فلسطین میں کیا ہونا چاہیے، ہم نے پچھلے سال برما میں دس دن گزارے۔ روہنگیا مسلمانوں کے صف اوّل کے لوگوں سے ہماری گفتگو ہوئی۔ بدھ مت کے سربراہ ویراتو سے ہماری بات ہوئی۔ اس کو نیوز ویک نے میانمر کا اسامہ بن لادن کہا ہے۔ اس سے ہماری ملاقات دو گھنٹے ہوئی۔ برما کے روہنگیا مسلمانوں سے ہم نے کہا کہ آپ برما کے مسلمانوں کا مقدمہ مذہبی طریقے سے نہیں بلکہ انسانی

حقوق کے حوالے سے پیش کریں۔ اس پر آپ کو زیادہ عالمی حمایت مل سکتی ہے۔ اصل چیز اچھے مقصد کا حصول ہے اب اصل مسئلہ یہی ہے کہ ان تنظیموں کے رویّوں سے مقصد حاصل ہو رہا ہے یا ہم مقصد سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔

صدارتی خطبہ

ڈاکٹر خالدہ غوث:

یہ ایسے موضوعات ہیں جن پر بار بار گفتگو ہونی چاہیے کیونکہ جب ہم عدم برداشت کی بات کرتے ہیں تو سیاسی، معاشی، سماجی، مذہبی، اخلاقی حوالے آجاتے ہیں۔ اسلام تو یونیورسل ہے لیکن جب کوئی خاص آئیڈیالوجی لے آتے ہیں تو پھر یہ بہت محدود ہو جاتا ہے اور عدم برداشت پھیل جاتی ہے۔ اس سے پیچیدگیاں بڑھی ہیں ان پر بحث کی جانی چاہیے۔ کیونکہ اس طرح سے کبھی طالبان ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور کبھی دولت اسلامیہ کی صورت میں۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ عدم برداشت کیلئے آپ کو بہت بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔ کیونکہ اگر ہم بات کرتے ہیں کہ ہمیں ایسا معاشرہ چاہیے جہاں پر We need to agree to disagree۔ اگر ہم اس اصول پر کاربند ہوں تو اخلاقی، مذہبی، سیاسی، سماجی سبھی اقدار آجاتی ہیں۔ ہم نے 2010ء میں ایک رپورٹ شائع کی کہ جو دہشتگردی ہے اس کا سوشل ڈویلپمنٹ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہم نے تنازع کے شکار علاقوں کا دورہ کیا، وہاں سروے کیا، اس کے نتیجے میں ہم نے دیکھا کہ دہشتگردی کا تعلق غربت سے نہیں ہے۔ عقائد کی رنگارنگی کسی بھی معاشرے کیلئے منفی نہیں ہوتی مگر معاشرے نے سمجھ لیا ہے کہ یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ ہمیں لوگوں سے جا کر بھی پوچھنا ہوگا کہ معاشرے میں عدم برداشت کیوں ہے، اس پر سروے ہونا چاہیے۔ اس کی وجوہات کیا ہیں اور اس کا حل کیا ہے۔ مجھے کبھی کبھار ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ہماری سرشت میں آگیا ہے۔ گھروں کے اندر دیکھیں تو مار دھاڑ ہے، خبروں میں دیکھیں تو مار دھاڑ ہے، ٹاک شوز کے لوگوں کے لہجے دیکھیں کہ کیا یہ ہمارا کلچر ہے۔ ہمارا معاشرہ صرف مذہب کے نام پر نہیں کئی طبقات میں بٹا ہوا ہے۔ اس لئے عدم برداشت کی وجہ کوئی ایک نہیں بلکہ کئی ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ 70ء یا 80ء کی دہائی میں برداشت کی کیا

صورتحال تھی اور آج کیا ہے۔اس پر بات مختلف اور متحارب طبقہ ہائے فکر کے ساتھ ضروری ہے کیونکہ معاشرہ بٹوارے کا شکار ہے۔ہم اصولی نہیں بلکہ جذباتی معاشرہ ہیں ہمارا طرز فکر بھی استدلالی نہیں ہے اس کی وجہ شاید ہمارا تعلیمی نظام ہی ہو۔

اب ہم نے فیصلہ کرنا ہے کہ ہم نے کیا مستقبل میں بھی اسی جذباتی انداز میں سوچنا ہے۔قوموں کی بنیادیں 2005 کا زلزلہ یا2010 کا سیلاب نہیں ہوتا کہ آفت کے موقع پر وہ اکٹھی کھڑی ہو جائیں بلکہ قوموں کی بنیاد کچھ اور ہوتی ہیں۔اس کیلئے ہمیں بنیادی ڈھانچے میں تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔ہماری رپورٹ کہتی ہے کہ ہمارے شہروں کی39 فیصد آبادی غربت کا شکار ہے۔آپ کے دیہات کے مقابلے پر چھوٹے شہروں میں غربت زیادہ ہے۔اگر آپ کی معاشی ترقی کے ساتھ سماجی ترقی نہیں ہوتی تو معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔اس کی وجہ صرف مذہب نہیں بلکہ کئی وجوہات ہیں۔

دوسری نشست : مذہبی عدم رواداری اور عمومی رویّوں کا بگاڑ

صدارت: ڈاکٹر عبدالحمید نیئر

مقررین: رومانہ بشیر، وسعت اللہ خان

ڈاکٹر عبدالحمید نیئر:

جب مذہبی عدم رواداری معاشرے میں پھیلتی ہے تو اس کی وجہ سے روزمرہ کے رویّوں میں بگاڑ آتا ہے اور معاشرے میں انتشار پھیلتا ہے۔عوام الناس کے اندر اس تبدیلی پر ہم بات کریں گے۔مذہبی رواداری کا تعلق عوام الناس سے نہیں بلکہ یہ ان لوگوں سے پیدا ہوتا ہے جو مذہبی علوم کے علمبردار ہوتے ہیں۔وہاں سے عدم رواداری کی بنیاد فتووٴں، ہدایات اور ان کے خطابات کے ذریعے آتی ہے پھر اس کی وجہ سے عام لوگوں میں ہیجان پھیلتا ہے۔

عنوان: مذہبی عدم رواداری اور پاکستان میں غیر مسلم

مقرر: رومانہ بشیر (سماجی کارکن و ایگزیکٹو ڈائریکٹر پیس اینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن)

میرا موضوع غیر مسلموں کی مشکلات کو پیش کرنا ہے۔پاکستان جیسا سوچا گیا تھا ویسا بن نہیں سکا اور جیسا بن گیا ویسا سوچا نہیں گیا تھا۔دوسری بات مثالی شہریت غیر مسلموں کے حوالے سے۔تیسری بات یہ ہے کہ ہم بچوں کو جو تاریخ پڑھا رہے ہیں وہ نامکمل ہے بالخصوص غیر مسلموں کا تحریک پاکستان میں جو کردار تھا اسے نہیں پڑھایا جاتا۔تاریخ کو پسند ناپسند کی بنیاد پر نہیں بلکہ حقائق کی بنیاد پر پڑھایا جاتا ہے۔چوتھی بات یہ کہ ہمارا استاد متوازن رویّوں کو پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔پانچویں بات یہ کہ قیام پاکستان کے وقت اقلیتوں کی تعداد25 فیصد تھی اور آج یہ تین سے چار فیصد ہے یہ ہمارے لئے سوچنے کی بات ہے کہ یہ کیوں ہوا اور اس کے پیچھے کیا کہانی ہے۔

اقلیتوں کے مقدمے کیلئے تین پہلو ہیں۔سیاسی، سماجی اور مذہبی۔تینوں میدانوں میں ان کو روزمرہ زندگی کے حوالے سے مسائل درپیش ہیں جو دن بدن بڑھ رہے ہیں، اقلیتوں کو قومی دھارے میں لانے کی جو کوششیں ہوئیں وہ بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکیں۔قائداعظم جس قسم کا پاکستان چاہتے تھے اس کا اظہار انہوں نے11 اگست کی تقریر میں پیش کیا۔مگر ہم نے اس بات کو ایک طرف رکھتے ہوئے12 مارچ1949ء کو قرارداد مقاصد منظور کر لی کہ اس کی بنیاد پر ہم پاکستان کا نظم و نسق چلائیں گے جبکہ قائداعظم نے بڑی دلیل سے یہ کہہ دیا تھا کہ ہماری مذہبی شناخت ہمارا ذاتی مسئلہ ہے اس کا امور مملکت کے ساتھ تعلق نہیں ہوگا۔مجھے ایسے لگتا ہے کہ مذہب اور ریاست کو بھی ایک لائن کھینچ کر بتایا گیا کہ یہ الگ الگ ہوں گے کیونکہ قائداعظم کو معلوم تھا کہ اگر یہ لائن نہ لگائی گئی تو آگے چل کر لوگ مذہبی گروہوں میں بٹ کر رہ جائیں گے۔

12اگست کو جب قرارداد مقاصد منظور کی گئی تو اس موقع پر جو اقلیتی نمائندے موجود تھے انہوں نے وہیں کہہ دیا تھا کہ آج جو کچھ آپ نے کیا اس کا نتیجہ پاکستان میں مذہبی اور مسلکی تقسیم کی صورت میں نکلے گا۔آج بالکل وہی منظر نامہ ہے مثالی شہریت کے حوالے سے آرٹیکل 25 کہتا ہے کہ ہم سب برابر کے شہری ہیں لیکن اس کے باوجود اس آئین میں جب مذہب کی بنیاد پر ترامیم کی گئیں تو غیر مسلموں کیلئے کئی قدغنیں لگا دی گئیں کہ ان ان عہدوں پر وہ نہیں پہنچ سکتے۔

میرا بہت بڑا سوال یہ ہے کہ اقلیتوں کو محسوس ہونا چاہئے کہ وہ قانون کی نظر میں برابر کے

شہری ہیں۔ جب صفورا کا سانحہ ہوا تو اس سے تھوڑی دیر پہلے یوحنا آباد کا سانحہ ہوا۔ سانحہ صفورا میں سب اعلیٰ حکام نے جا کر تعزیت کی مگر یوحنا آباد میں وزیراعلیٰ تک نہیں گئے۔ اس حوالے سے اقلیتوں کا دکھ اور بڑھ جاتا ہے۔

قائداعظم یونیورسٹی میں تاریخ کے حوالے سے ایک سیمینار ہوا۔ مجھے وہاں بلایا گیا وہاں جب میں نے مقالہ پیش کیا جس میں تاریخی حقائق بیان کئے کہ قائداعظم نے کیسے اقلیتوں کے پاس جا جا کر حمایت طلب کی اور عیسائیوں نے باؤنڈری کمیشن کے سامنے پیش ہو کر یہ کہا کہ ہمیں مسلمانوں کے ساتھ گنا جائے۔ پنجاب اسمبلی میں جب پاکستان کیلئے ووٹنگ ہوئی تو ووٹ برابر ہوگئے وہاں پر پاکستان کے حق میں فیصلہ کن ووٹ ایک مسیحی سپیکر ایس پی سنگھا نے ڈالا اور پھر حالات بدل گئے۔ یہ باتیں ہمارے بچوں کو نہیں معلوم۔ وہاں ایک نوجوان ٹیچر کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا کہ آپ نے اتنی دیر سے غیر مسلموں کے حقوق کا شور مچا رکھا ہے، ذرا مجھے یہ تو بتائیں کہ جب تقسیم ہوئی تو کتنے غیر مسلم مرے تھے۔ تو میں نے کہا کہ آپ کا سوال میرے لئے اچنبھے کی بات ہرگز نہیں کیونکہ آپ نے وہ تاریخ ہی نہیں پڑی جو اس سوال کا احاطہ کرے۔ میں نے کہا کہ جب قافلوں پر دونوں طرف سے حملے ہو رہے تھے تو ایک مسیحی نے گلے میں صلیب لٹکا کر قافلے اُدھر سے ادھر اور ادھر سے اُدھر پہنچائے تا کہ حملہ آوروں کو معلوم ہو سکے کہ یہ مسلمان یا ہندو نہیں بلکہ عیسائی ہیں۔ یہ باتیں ہماری سماجی اور قومی آہنگی کیلئے مددگار ہو سکتی تھیں مگر یہ ہمارے نصاب کا حصہ نہیں ہیں۔ میں نے جب ایم اے میں اسلامیات کا پیپر دیا تو اس میں لکھا ہوا تھا کہ مسیحی تین خداؤں کو مانتے ہیں۔ اس طرح میں وزارت تعلیم کے ساتھ اخلاقیات کی نصاب سازی کی کمیٹی میں تھی اس میں لکھا تھا کہ Baptism کسے کہتے تھے۔ جواب میں کہا گیا تھا کہ چرچ میں پادری مساج کرتے ہیں۔ میں نے تو آج تک کسی چرچ میں مساج سینٹر نہیں دیکھا۔ جن کو معلوم ہی نہیں کہ Baptism کی عیسائیت میں کیا ویلیو ہے وہ یہ سب کچھ لکھ رہے ہیں۔ ایک اور کتاب میری نظر سے گزری تو اس میں حضرت عیسیٰ کے بارے میں ایسی باتیں لکھی گئیں جس سے عیسائیوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ پھر اسی مضمون میں آخر میں یہ بھی لکھا گیا کہ عیسائی مذہب میں تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ اس طرح ہندوؤں کے حوالے سے ہم تذلیل کرتے ہیں۔ بھارت میں کانگریس یا بی

جے پی جو کچھ کرتی ہے تو یہاں اسے ہندوؤں کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے حالانکہ کانگریس کے کئی صدر مسلمان بھی رہے۔ یہ چیزیں ہمیں بچوں کو بتانے کی ضرورت ہے۔ تعلیم جو قوموں کی تعمیر کیلئے استعمال ہوتی ہے ہم نے اس کو تفرقے کیلئے استعمال کیا۔ استاد کا رویہ بھی غیر مسلم بچوں کے ساتھ متعصّبانہ ہوتا ہے۔ ایک کلاس ٹیچر نے ایک غیر مسلم بچے کو کہا کہ جب میں کافر کہوں تو آپ نے مائنڈ نہیں کرنا۔ گنتی میں کم ہونے کا مطلب ادنیٰ و اعلیٰ نہیں لیکن ہمارے ہاں اسے مسلمان اور کافر سمجھا جاتا ہے۔ یہ سب ہمارے رویّوں میں اس قدر سرایت کر چکا ہے کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

قومی اسمبلی میں خواتین کیلئے الگ نشستیں رکھی گئیں مگر اقلیتوں کی خواتین کی صرف تین نشستیں ہیں۔ ایک مسیحی بچے کو ممتحن نے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا کہ اس بچے کا وضو نہیں ہے۔ اس لئے میں اس کو امتحان میں بیٹھنے نہیں دوں گا۔ بہت ساری جگہوں پر اخلاقیات کے الگ استاد نہیں ہیں بلکہ اسلامیات کے استاد ہی اخلاقیات پڑھا رہے ہیں۔ اس کے باوجود اقلیتیں محبِّ وطن شہری ہیں۔

عنوان: عدم برداشت، شدت پسندی اور میڈیا کا کردار

مقرر: وسعت اللہ خان

بحیثیت انسان میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں شر پسند اور شریر آدمی ہوں اور شر میرے خیال میں فاسفورس سے بنتا ہے اور خیر گیلی لکڑی ہوتی ہے۔ فاسفورس کو آپ صرف ماچس کی ایک تیلی دکھاتے ہیں اور وہ جل اٹھتا ہے جبکہ گیلی لکڑی سے روشنی پیدا کرنے کیلئے محنت کرنا پڑتی ہے۔ اگر شر میرے اندر غالب طاقت نہ ہوتی اور فاسفورس کا بھی وجود نہ ہوتا تو پھر نہ کسی پیغمبر کو آنے کی ضرورت تھی نہ ہی کسی مذہب کی ضرورت ہوتی۔ خیر کی قوت اگر اتنی ہوتی کہ وہ شر پر قابو پا سکتی تو معاملہ ٹھیک چلتا مگر ایسا نہیں ہوا۔

ایک لاکھ 24 ہزار پیغمبر اور کروڑوں اولیاء آئے۔ آج ہم کئی کروڑ سال بعد بھی اس ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے یہ غور کر رہے ہیں کہ عدم رواداری، عدم برداشت اور تنگ نظری کیا ہوتی ہے؟

اس کی وجہ ہے کہ شر خاصا طاقت ور ہے اور اسے آسانی سے شکست نہیں دی جا سکتی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اتنا ہی آسمان نظر آتا ہے جتنی بڑی ہماری کھڑکی ہے اسی وجہ سے ہمیں عیسائی، ہندو، مسلمان، سکھ کی وردی پیدائشی طور پر پہنائی گئی ہے اور مجھے تاثر یہ دیا گیا ہے کہ یہ تمہاری وردی نہیں تمہاری کھال ہے تم اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔ ہماری زبانیں یہ کہتے کہتے تھک گئی ہیں کہ ہر مذہب رواداری کا درس دیتا ہے اور عدم رواداری دراصل ہمارا قصور ہے۔ کیا ہم مذہب سے بھی زیادہ طاقتور ہیں کہ وہ تو رواداری کی بات کر رہا ہے اور ہم عملی طور پر عدم رواداری پر یقین رکھ رہے ہیں۔ اس کی کچھ وجوہات تو ہوں گی، عدم رواداری کیوں پیدا ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں جب یہ سمجھتا ہوں کہ میں آپ سے اعلیٰ اور برتر ہوں تو میرا دماغ چھوٹا ہونا شروع ہو جاتا ہے جسے احساس تفاخر کہتے ہیں۔ جو مذہبی بھی ہو سکتا ہے علاقائی بھی ہو سکتا ہے اور آپ کے اندر کی نرگسیت بھی ہو سکتی ہے۔ وہاں سے تنگ نظری کا سفر شروع ہوتا ہے، سچائی کبھی تنگ نظر نہیں ہو سکتی۔ اس وقت تک جب تک سچائی میں جھوٹ کا کھوٹ نہ ملایا جائے۔ ہمیں اپنا کاروبار چلانے کیلئے سنار کی طرح جو خالص سونے سے زیور نہیں بنا سکتا، اس طرح ہمیں سچائی میں جھوٹ ملانا پڑتا ہے۔ میں کسی مذہب کی بات نہیں کر رہا ہم سب اس میں شریک ہیں۔ تنگ نظری کسی خاص نظریئے یا عدم نظریے سے مشروط نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ جو فاسفورس کا شر ہمارے اندر ہے وہ مختلف شکلیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ یہ ریڈیو سونی کا ہے یہ سانیو کا ہے اور یہ ہٹاچی کا ہے۔ ذرا سی تحقیق کر لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ جو برانڈ نیم ہے اس کو کسی ایک کمپنی نے تیار کر کے مختلف کمپنیوں کو دیئے ہیں تاکہ وہ اپنے اپنے لیبل لگا کر اسے مارکیٹ کر سکیں۔ میرے نزدیک لشکر جھنگوی، بوکو حرام، شیو سینا، یہودیوں کی شاز پارٹی، کمبوڈین خلل روج، امریکہ کی کو کلس کلان، بوسنیا کی سرب سٹیٹ، یہ سب کے لیبل الگ الگ ہیں مگر یہ ایک کنٹریکٹر نے بنا کر دیئے ہیں۔ یہ بات اگر سمجھ میں آ جائے تو آدھا مسئلہ حل ہو سکتا ہے مگر چونکہ ہمیں اپنی ناک لمبی رکھنی ہے اس لئے ہم صرف وہی دیکھیں گے جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم پورے منظر کو نہیں دیکھیں گے۔ ہم صرف اس چیز کو دیکھیں گے جو ہمارے دل کو بھاتا ہے چاہے وہ اچھا ہے یا برا ہے۔ تو پھر تنگ نظری سے عدم برداشت کا بیج جنم لیتا ہے اور اس سے شدت پسندی

کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور جب اسے تفاخر کا پانی ملتا ہے تو پھر دہشتگردی کا تن آور درخت بن جاتا ہے اور پھر برگد کی طرح اندر ہی اندر جڑیں پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ یاد کریں بچپن میں جب کسی نے کسی کو تھپڑ مارا ہوگا تو آپ کا رویہ کیسا ہوگا کیا آپ نے نظریں نیچی کر لی تھیں یا آپ نے زبان سے کچھ کہا تھا یا آپ چپ ہو گئے تھے یا پھر اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔ اگر زیادہ لوگ جب ایک آدمی دوسرے کو مارتا ہے اسے چیلنج کر دیں تو دوسرا تھپڑ مارتے وقت وہ کچھ سوچے گا ضرور، میرا خیال ہے کہ ہمیں مجرم اپنے اندر تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے سوچا کہ ایک تھپڑ ہی تو ہے آپس کی لڑائی ہے پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے۔ ہم نے کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی جس کی وجہ سے وہ تھپڑ تشدد میں تبدیل ہوا پھر وہ گروہی تشدد میں تبدیل ہوا ہم برداشت کرتے رہے پھر وہی تشدد قتل میں تبدیل ہوا۔ ہم نے کہا کہ قتل تو ہوتے رہتے ہیں پھر وہی قتل قتلِ عام میں تبدیل ہو گیا۔ کہانی پہلے تھپڑ کو نہ روکنے سے شروع ہوئی تھی جس کا آج ہم خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تشدد، خود کش حملے، اغواء، ٹارگٹ کلنگ۔ آپ کوئی بھی نام اس تشدد کا لے لیں۔ ہم تلاش کر رہے ہیں کہ یہ فلانے کی غلطی ہے اسلام تو امن اور خیر کا مذہب ہے۔ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں۔ پھر تو یہ بہت ہی بھیانک صورتحال ہے کہ یہ مٹھی بھر لوگ امن پسندوں کے قابو میں نہیں آ رہے۔ یہ کس طرح کی اکثریت ہے جو یہ بھی کہتی ہے یہ مٹھی بھر لوگ ہیں مگر ان لوگوں کو وہ ڈی سیٹ بھی نہیں کر رہی۔ ڈس لاج بھی نہیں کر رہی بلکہ ایک معذرت خواہانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ جب کوئی پیرس میں جا کر پھٹتا ہے کوئی دمشق میں جا کر پھٹتا ہے۔ کوئی دلی میں یا کراچی میں تو ہم وہ شتر مرغ ہیں جو اس حملے میں اپنا سر چھپا لیتے ہیں کہ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں۔ اگر یہ اتنے ہی ہیں تو تمہارے قابو میں کیوں نہیں آ رہے۔ یہ مٹھی بھر لوگوں کا قصور نہیں بلکہ یہ اس اکثریت کا قصور ہے جس کی ذہنیت ان مرغیوں کی طرح ہے جن کا پنجرہ ہر صبح بھرا جاتا ہے صرف ایک قصائی ہوتا ہے شام کو وہ پورا پنجرہ خالی کر دیتا ہے اگلے دن وہ پھر نیا پنجرہ بھر لیتا ہے ہم وہ مرغیاں ہیں۔

اب میں اپنے کاروبار کی طرف آ رہا ہوں، جو یہ کہتا ہے کہ میڈیا ایک مقدس پیشہ ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔ میڈیا بھی اتنا ہی کاروبار ہے جتنا صابن بنانے کی فیکٹری ڈالنا۔ جتنا پرچون کی دکان کھولنا یا ٹھیکیداری کرنا، ہر کاروبار منافع کیلئے کھولا جاتا ہے۔ کچھ معاشروں میں ملاوٹ نہ

کرنے کی روایت بہت مستحکم ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں جس طرح گھی میں ملاوٹ ہوتی ہے اسی طرح میڈیا میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے۔ آپ کو آدھا سچ آدھے جھوٹ میں ملا کر بیچا جاتا ہے اس لئے کہ وہ مصالحہ لوگوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ پھیکی کھچڑی آپ میں سے کتنے لوگ کھا سکتے ہیں آپ کو مصالحے ڈالنے پڑتے ہیں۔ مجھے تو اپنا مصالحہ بیچنا ہے، اس میں پھر مشن کہاں سے آ گیا۔ سیدھا سادھا کاروبار ہے۔ میڈیا کو اس پس منظر میں دیکھیں۔ چونکہ ہمیں بطور میڈیا پرسن پتہ چل چکا ہے کہ یہ معاشرہ مذہبی ہے۔ اب مذہب کو ہم ساشے میں بیچنے کی کوشش کریں یا پیکٹ میں یا تھوک میں۔ جیسی مارکیٹ ہو گی ویسی ہی حکمت عملی ہو گی آپ لوگ خرید بھی رہے ہیں مزہ بھی آ رہا ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ میری مرچ بہت تیز ہے۔ مذہبی پروگرام ہر رمضان میں پانی کی بوتل کی طرح بک رہے ہیں۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ ایک طرح کے علماء ہیں اب پتہ چلا کہ دو طرح کے علماء ہیں۔

ایک وہ جو واقعی علماء ہیں جنہیں شہرت سے کوئی غرض نہیں اور جو اپنی مساجد، حجروں اور مدارس میں ہیں۔ جو کوئی ان کے پاس جا کر جو پوچھتا ہے وہ بتا دیتے ہیں۔ ہر فرقے میں اس طرح کے علماء ہیں۔ دوسری قسم کے علماء ڈسکو علماء ہیں۔ انہوں نے لیبل لگایا ہوا ہے کہ ہم مفتی ہے، الحاج ہیں، قاری صاحب ہیں لیکن ایک نمبر اور دو نمبر تو چائنا کے مال میں ہوتا ہے۔ اگر یہاں ہے تو کیا مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ مارکیٹ موجود ہے۔ ایک نمبر کے علماء ڈاکٹر عامر لیاقت حسین کے پروگرام میں کیوں نہیں آتے۔ صرف وہ کیوں آتے ہیں جو موم کے بنے ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس سے بلی بنا لیں، چاہیں تو موم بتی میں ڈھال لیں۔ اس طرح کے علماء آتے ہیں جو میڈیا کو سوٹ کرتے ہیں۔ چاہے شر پھیلاؤ مگر ہمیں ریٹنگ لا کر دو تا کہ ہمارا پیسہ ڈبل ہو۔ ان کے لاکھوں پیروکار ہیں۔ شاید آٹھ یا دس چیلنج کرنے والے بھی ہوں گے۔ اب اگر آٹھ دس لاکھ پیروکاروں میں سے دس چیلنج کرنے والے ہوں گے تو کیا ہوگا۔ یہ جو دو نمبر علماء ہیں جنہیں ایک نمبر علماء اچھی طرح جانتے ہیں مگر اپنی وضعداری اور کسی مصلحت کی وجہ سے وہ درگزر فرماتے ہیں اور اس بنیاد پر معاشرہ یہ تاثر لے رہا ہے کہ اصل لوگ وہی ہیں جو ٹی وی پر آ رہے ہیں۔ جو مذہب کے نام پر ہر طرح کی بے مذہبی پھیلا رہے ہیں جو اپنا چورن بیچ رہے ہیں۔ حکومت کبھی کبھی جرأت سے کام

لیتی ہے۔ جس طرح گندم کی نقل وحمل پر بین الصوبائی پابندی آتی ہے اسی طرح علماء کی نقل وحرکت پر بھی پابندی لگا دی جاتی ہے۔ یہ معمول کی بات ہے مگر ان کا موبائل کام کر رہا ہوتا ہے۔ لوگ آزادانہ ان کے پاس آتے جاتے ہیں۔ اگر یہ علماء واقعی شرپسند ہیں تو آپ ہر سال یہ تکلفات کیوں کرتے ہیں آپ انہیں مستقل بین کیوں نہیں کر دیتے۔ اس کا مطلب کہ ایک لیول اور مقام پر ان کی پذیرائی موجود ہے۔ انہی علماء کی آپ کو کسی نہ کسی متن میں ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں چاہتے کہ انھیں محرم اور ربیع الاول میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ میرا سوال یہ ہے کہ علماء جن کی بین الاضلاع نقل وحمل پر پابندی لگائی جاتی ہے انہیں ٹی وی پر کیسے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سنا کہ پیمرا نے کبھی کہا ہو کہ آپ کے فلاں اینکر یا عالم نے اشتعال انگیزی کی اور اب یہ آپ کے ٹی وی پر نہیں آ سکتا یا یہ کسی بھی چینل پر نہیں جا سکتا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے میں کنٹونمنٹ کی چوکی پر جاتا ہوں تو ایک فوجی مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ کے پاس کیمرہ تو نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نہیں میرے پاس موبائل فون ہے وہ کہتا ہے کہ آپ جائیں۔ یہ بالکل وہی صورتحال ہے۔

غلہ منڈی میں ایک ہی کمیشن ایجنٹ کی 100 دکانیں کیوں نہیں ہوسکتیں یہ اس لئے کہ یہ معاشی مسئلہ ہے ہر ایک کو اپنا گھر چلانا ہے اور چھوٹا موٹا کام کرنا ہے۔ فرقوں کو بھی آپ چھوٹی موٹی دکانیں سمجھ لیں۔ کون اپنے پیٹ پر لات مارے گا، کون بے روزگار ہونا پسند کرے گا۔ اچھی باتوں پر کسی ایک فرقے میں مشترکہ ایجنڈا بن سکتا ہے مگر مجھے جو چار لاکھ لوگوں میں عزت ملی ہوئی ہے میرا جو سماجی اثر ورسوخ ہے اس سے میں کیسے دستبردار ہو جاؤں۔ یہ تفرقے اسی طرح قائم رہیں گے۔ یہ بڑی آئیڈیل صورتحال ہے کہ ہم ملتِ واحدہ ہیں قرآن ایک ہے، رسول ایک ہے، خدا ایک ہے، بہت اچھا لگتا ہے لیکن عملی طور پر ہم اس جانب نہیں آئیں گے کیونکہ پھر ہماری دکانیں بند ہو جائیں گی۔ چاہے اگر اور کچھ نہیں تو یہ طے کر لیں کہ یہ ملک مسلمانوں کا ہے یا پاکستانیوں کا، اگر یہ بات اکثریت کی سمجھ میں آ جائے تو ہمیں اس طرح کی کانفرنسوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔

سوالات

ڈاکٹر سجاد:

رومانہ بشیر سے ایک سوال ہے کہ آپ نے کئی مثالیں پیش کیں زیادہ تر نصاب سے متعلق تھیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ کالج اور یونیورسٹی سطح پر بین المسالک بھی اسی طرح کی متعدد مثالیں ہیں۔ایک مصنف جو نصاب کا حصہ ہوتا ہے اس کی وابستگی جس مسلک سے ہوتی ہے اس کی تعریف کرتا ہے اور مخالف مکتب کی ایسی تیسی کر دیتا ہے۔اس کی وجہ مذہبی جہالت ہے۔

رومانہ بشیر:

میرے خیال میں آپ کے سوال کے اندر ہی جواب ہے۔جب میں اقلیت کی بات کرتی ہوں تو اس میں مسلمانوں کی اقلیتیں بھی شامل ہیں۔

سوال: مجھے وٹس ایپ پر میسج ملا کہ مسجد نبوی کے امام انتقال کر گئے۔یہ خبر میں نے دو بڑے اخبارات کی ویب سائٹ پر سرچ کی تو وہاں دلیپ کمار کی بیماری کی خبر تو تھی مگر یہ خبر نہ تھی بلکہ یہ اگلے دن کے اخبارات میں ملی، یہ ہم قوم کو کیا پیغام دے رہے ہیں۔

وسعت اللہ خان:

میرے خیال میں، میں نے میڈیا کو جتنی گالیاں دیں اس سے آپ کی تشفی ہوئی نہیں۔

سوال: کوئی بھی استاد کلاس میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ کلاس میں مسلمان اور غیر مسلمان کا فرق رکھے۔میرے پاس ذکری بچے قرآن مجید پڑھنے آتے ہیں حالانکہ ان کے والدین مسلمان نہیں ہیں۔یہودی یا عیسائی تو اہل کتاب ہیں ہم ان کو اقلیت تصور بھی نہیں کرتے اسی طرح ہم کسی بھی مذہب کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی دور میں الہامی رہا ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالحمید نیئر:

اس نشست کا ایک ضمنی عنوان یہ تھا کہ شدت پسندی سے عام لوگوں کے رویّوں میں کیا تبدیلی آئی ہے۔انہوں نے اپنے ذہنوں کے سوچ آف کر دیئے ہیں اور یہ سوچ اس وقت آن

ہونے ہیں جب لاؤڈ اسپیکرز سے اعلانات ہوتے ہیں۔اب لوگوں کے رویّے اتنے تبدیل ہو چکے ہیں کہ وہ بغیر کسی تصدیق کے باہر نکل آتے ہیں اور توڑ پھوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ہمیں یہ بات علماء سے کہنی چاہیے کہ وہ اعلانات سے پرہیز کریں بلکہ قانونی راستہ اختیار کریں۔ہماری عدم رواداری کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے۔وہ اسباب جو سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری معاشرے میں پیدا نہیں ہونے دیتے،اس حوالے سے گروپس نے جو رپورٹس دیں ان کے مطابق:۔

1- لوگوں کا خیال ہے کہ ذمہ دار حکومت ہے،حکمرانی کا فقدان ہے جو عدم رواداری کا ماحول پیدا کرتی ہے جو قوانین تشکیل دیئے جاتے ہیں ان پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔

2- بین الاقوامی سازشیں: میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کا ہر ملک جب بھی کمزوری دکھاتا ہے تو بہت سے گدھ اور چیلیں اس کے گرد منڈلانے لگتے ہیں لہٰذا جو کمزوری دکھا رہا ہے اس کو شکایت نہیں کرنی چاہیے کہ گدھ اس کے اطراف میں کیوں جمع ہو رہے ہیں۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اندرونی کمزوریاں اتنی زیادہ ہیں کہ ہم بین الاقوامی ہاتھوں میں کھلونا ہو کر رہ گئے ہیں اس کا حل یہ نہیں کہ ہم انہیں کہیں کہ سازشیں نہ کرو۔

3- تعلیمی ادارے کردار ادا نہیں کر رہے،نصاب متوازن نہیں،استاد بھی متحرک نہیں ہیں کہ وہ کوئی بہتری لائیں،تعلیم میں تربیت کا فقدان ہے،یہ بات درست ہے تعلیمی اداروں میں تعلیم مہیا کرنا ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے اگر وہ اپنے کندھے جھاڑ کر اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے تو پھر یہی کچھ ہوگا۔سرکاری تعلیمی ادارے پسماندگی کا شکار ہیں لوگ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو ترجیح دیتے ہیں۔نصاب میں توازن بھی حکومت کا کام ہے۔استاد کو ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہونا چاہیے وہ مسلم اور غیر مسلم کی بنیاد پر طالب علموں میں تفریق نہ رکھے۔

4- ملت واحدہ کے تصور کا فقدان ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مسلم دنیا ایک ملت ہے،اب یہ تصور خود ہی منتشر ہے،عرب اور غیر عرب میں اور کئی قومیتوں میں، ہر ایک اپنے مسائل سے نبرد آزما ہے۔اگر ہم ملت کے ساتھ استواری رکھنا بھی چاہیں تو دیگر اقوام یہ تعلق رکھنا نہیں چاہتیں۔وہ ہمیں صرف اپنی منڈی کا صارف سمجھتی ہیں۔

5- ہمارے معاشرے میں بدعنوانی بہت زیادہ ہے، اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اس کے علاوہ انفرادی طور پر افراد میں اخلاص و تربیت کا فقدان، قول و فعل میں تضاد اور عدم برداشت کا ہونا۔ ان سب کیلئے آپ صرف خواہش کر سکتے ہیں۔ اگر لوگ باکردار ہو جائیں تو پھر یہ ہوسکتا ہے، تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ باہر کی دنیا میں صرف حکمرانی اچھی ہونے سے لوگوں کا اخلاق اچھا ہو جاتا ہے۔

تجاویز:

1- انتظامیہ عدلیہ، مقننہ اپنی اپنی حدود کے اندر رہ کر کام کریں، اپنے فرائض صحیح طریقے سے نبھائیں۔ اس کا ذمہ ہم کو لینا چاہیے کہ اگر ہمارے حکمران صحیح کام نہیں کر رہے تو ہم آنکھیں پھیریں گے نہیں بلکہ پلٹ کر حکومت کا گریبان پکڑنے کی کوشش کریں گے۔ اس کیلئے جرات چاہیے اس کیلئے آپ کو بے غرض ہونا پڑے گا۔ ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھتی رہنی چاہیے۔

2- اپنی کمزوریوں کو دور کیا جائے۔

3- جہاں حق ہو ہمیں اس کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا۔ اس میں ہمیں رنگ و نسل، مذہب یا قومیت کا فرق نہیں کرنا چاہیے۔

4- استاد کو ایک اچھا ماہر نفسیات ہونا چاہیے جو کہ بچوں کو سوالات پر اکسائے۔

5- سماجی ہم آہنگی کیلئے سیکنڈری سکولوں کی سطح پر نصاب میں مضامین شامل کئے جائیں۔ کالج، سکول کے اساتذہ کیلئے بھی ایسی ورکشاپس منعقد کی جائیں تا کہ وہ سماجی ہم آہنگی کیلئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کریں۔

6- معلم کا علم بہت وسیع ہو۔

7- معلم کے واسطے شعبہ حرب کا کمال ہونا چاہیے۔ یہ البتہ بحث طلب بات ہے۔

8- استاد کو رول ماڈل ہونا چاہیے۔

9- طالب علموں کو سکولوں میں ہی دوسرے مذاہب کے بارے میں بنیادی معلومات دی

جائیں تا کہ اگر کوئی انہیں غلط معلومات دینا چاہے یا نفرتیں پیدا کرنا چاہے تو وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

10- دینی مدارس میں دیگر مذاہب کو بھی پڑھایا جائے۔

11- تکثیریت کو فروغ دیا جائے۔

12- جید علماء کی تجویز ہے کہ مدارس میں داخلے کیلئے کم سے کم شرط میٹرک پاس ہو تا کہ لوگ پہلے سے وسیع علم حاصل کرنے کے بعد مدرسے کا خصوصی علم حاصل کریں۔

13- میڈیا کے منفی کردار کو روکنے کی کوشش کی جائے۔

آراء:

1- مدارس میں داخلے کیلئے میٹرک کی جو شرط رکھی گئی ہے وہ اچھی ہے۔ ہائیر ایجوکیشن نے مدارس میں داخلے کی شرط مڈل رکھی ہے۔ اس کی سب پابندی کرتے ہیں مگر آگے جا کر ہائیر ایجوکیشن کمیشن ان کی اسناد کی تصدیق کیلئے مسائل کھڑے کرتا ہے۔ مدارس کی سب سے اعلیٰ ڈگری عالمیہ صرف ٹیچنگ کیلئے مختص ہے۔ امتیازی سلوک ہے کہ وہ اس ڈگری کو کسی اور شعبے میں استعمال نہیں کر سکتے۔

2- بچوں کی اخلاقی تربیت بھی ہونی چاہیے۔

3- اس وقت دارالعلوم کراچی میں میٹرک پاس طلبہ ہی داخلہ لے سکتے ہیں اگر تمام مکاتب فکر اس کی پیروی کریں تو بہتری کی توقع ہے۔

4- بحیثیت استاد اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ بلا لحاظ عقیدہ اپنے شاگرد کو تعلیم دے۔

5- یہاں آ کر ہمیں دوسرے مکاتب فکر کو سننے کا موقع ملا۔ ہم جذباتی قوم ہیں۔ Emotional Inteligence کو نصاب میں شامل کیا جائے۔ ہمیں صرف ڈاکٹر نہیں چاہئیں انجینئر نہیں چاہئیں بلکہ ایسے لوگ چاہئیں جن کے کردار اعلیٰ ہوں اس کیلئے انہیں اخلاق و دین کا بنیادی علم دیا جائے۔ ایک دوسرے کی رائے کو احترام دینے کا سبق بھی نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

-6 اسلام سب سے زیادہ زور امن پر دیتا ہے اس لئے اساتذہ اس پیغام کو عام کریں، عدم برداشت کے رجحان کے خلاف کام کریں۔

-7 وہ رول ماڈل ہیروز جنہوں نے سماجی و مذہبی ہم آہنگی کیلئے کام کیا ہے ان سے عوام کو روشناس کرایا جائے۔ مثلاً ایدھی صاحب اور ان جیسے دوسرے ہیروز کی خدمات کو اجاگر کیا جائے۔

-8 ہمیں مطالعے کے رجحان کو فروغ دینا چاہیئے تاکہ وسعتِ علم سے ہم لوگوں کے ذہن بھی کھلیں۔

خورشید ندیم

یہاں سماجی ہم آہنگی و مذہبی رواداری کیلئے رویّوں پر بات ہوئی۔ رویّوں میں دو کمزوریاں ہیں جس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں Rational Thinking نہیں ہے۔ چیزوں کو منطقی استدلال سے سمجھنے کی ہم میں تربیت نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ مزاجوں میں لطافت اور نرمی نہیں بلکہ ایک سختی ہے ذرا ذرا سی بات پر لڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ بطور طالب علم میرا احساس یہ ہے کہ دو چیزوں پر ہم اپنے طالب علموں کو مائل کریں ایک فلسفہ اور دوسرا ادب۔ فلسفہ پڑھنے سے منطقی مزاج بنانے میں مدد ملتی ہے اس لئے اگر فلسفے کو پڑھایا جائے کہ نقطہ نظر کیسے وجود میں آتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ادب کا مطالعہ انسان کے مزاج میں لطافت پیدا کرتا ہے، انسان دو چیزوں عقل اور جذبات کا مجموعہ ہے اگر اس کے عقل اور جذبات کا تزکیہ ہو جائے تو وہ بہت اچھا انسان بن سکتا ہے۔ فلسفہ، ادب، شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کی طرف طالب علموں کو مائل کریں تو ان کا مزاج بھی منطقی ہو گا اور ان کے اندر لطافت بھی پیدا ہو گی۔

ڈاکٹر عبدالحمید نیئر:

وسعت مطالعہ کیلئے ضروری ہے کہ طالب علموں میں زبان کی استعداد بڑھائی جائے جب تک انہیں سمجھ نہیں آئے گی وہ پڑھیں گے نہیں۔

دوسری ورکشاپ

30-31- مئی کو مری میں ہونے والی دوروزہ تربیتی ورکشاپ کی روداد

پہلا دن

نشست اوّل: تعارف، پس منظر اور لائحہ عمل

صدارت: خورشید ندیم (محقق، دانشور و کالم نگار)

استقبالیہ کلمات: محمد عامر رانا (ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز

شرکاء کا تعارف، موضوع پر اظہار خیال اور گروپوں کی تشکیل

دوسری نشست: مسائل کی نشاندہی اور تجاویز

تیسری نشست: گروپ رپورٹس اور ان پر بحث

صدارت: عمار خان ناصر (مذہبی سکالر، الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ)

چوتھی نشست

صدارت: خورشید ندیم (محقق، دانشور و کالم نگار)

مقررین: ڈاکٹر قبلہ ایاز (سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی)

ڈاکٹر خالد مسعود (سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل)

دوسرا دن

پہلی نشست: عدم برداشت اور شدت پسندی

خورشید ندیم (محقق، دانشور و کالم نگار)

مقررین: ڈاکٹر قبلہ ایاز (سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی)

محمد عامر رانا: (ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز)

دوسری نشست

صدارت: ڈاکٹر عبدالحمید نیئر (سابق پروفیسر قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد)

مقررین: رومانہ بشیر (سماجی کارکن وا یگزیکٹو ڈائریکٹر پیس اینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن)

وسعت اللہ خان (صحافی، کالم نگار و اینکر پرسن)

آخری نشست

گروپ رپورٹس

صدارت: عمار خان ناصر (مذہبی سکالر الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ)

......o......

شرکاء

۱۔ شفیق الرحمٰن: لیکچرار، شعبہ اسلامیات گورنمنٹ ڈگری کالج بدن کرم ایجنسی

۲۔ شاہین عمر: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ کالج سول کوارٹرز پشاور

۳۔ سیف اللہ: لیکچرار فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل سائنسز پشاور یونیورسٹی

۴۔ ڈاکٹر محمد ظاہر شاہ: پروفیسر و سربراہ شعبہ عربی، پشاور یونیورسٹی

۵۔ محمد نواز صافی: لیکچرار، شعبہ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی

۶۔ ضیاء الدین: لیکچرار، شعبہ قانون و شریعہ، سوات یونیورسٹی

۷۔ غلام مصطفیٰ: لیکچرار شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج یکہ غنڈ مہمند ایجنسی

۸۔ سمیع اللہ: لیکچرار، شعبہ اسلامیات، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی پشاور

۹۔ ڈاکٹر رشید احمد: اسسٹنٹ پروفیسر اسلامک اسٹڈیز، شیخ زید اسلامک سینٹر پشاور یونیورسٹی

۰۱۔ ڈاکٹر انصار الدین مدنی: اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ڈویلپمنٹ، قراقرم یونیورسٹی گلگت

۱۱۔ ڈاکٹر عبدالحیمن: سربراہ شعبہ اسلامیات و مطالعہ مذاہب، ہری پور یونیورسٹی

۲۱۔ واحد گل: لیکچرار اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج یکہ غنڈ مہمند ایجنسی

۳۱۔ سونیا عنبرین: لیکچرار سیاسیات شہید بینظیر بھٹو یونیورسٹی پشاور

۴۱۔ مجیب الرحمٰن داور: لیکچرار، اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج بدن کرم ایجنسی

۵۱۔ ڈاکٹر عبدالحق: ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات و مذہبی امور مالاکنڈ یونیورسٹی چکدرہ دیر

۶۱۔ ڈاکٹر آفتاب احمد: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، شہید بینظیر بھٹو یونیورسٹی دیر

۷۱۔ سید محمد انور شاہ: اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج نمبر ون ڈیرہ اسماعیل خان

۸۱۔ فیاض الرحمٰن: لیکچرار اسلامیات گورنمنٹ ڈگری کالج میر علی شمالی وزیرستان

۹۱۔ شیر علی: شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول گلنائی مہمند ایجنسی

۰۲۔ عبدالرحمٰن خلیل: لیکچرار، فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، پشاور یونیورسٹی

۱۲۔ ساجد محمود: لیکچرار، شعبہ اسلامیات، ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

۲۲۔ امین اللہ: لیکچرار، شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج کھگا خیل لنڈی کوتل، خیبر ایجنسی

۳۲۔ قیصر بلال: لیکچرار، شعبہ اسلامیات، فاسٹ نیشنل یونیورسٹی پشاور

۴۲۔ ڈاکٹر حافظ صلاح الدین: چیئرمین ایسوسی ایٹ پروفیسر، فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز عبد الولی خان یونیورسٹی مردان

۵۲۔ ڈاکٹر خدیجہ عزیز: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، شہید بینظیر بھٹو ویمن یونیورسٹی

پشاور

۶۲۔ ڈاکٹر فرہاد اللہ: پروفیسر اینڈ چیئر مین، سینٹر فار ریلیجس اسٹڈیز، کوہاٹ یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی

۷۲۔ پروفیسر زبیر حسین شاہ: پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج پٹن کوہستان

۸۲۔ محمد سعید خان: اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامیات، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج کرک

۹۲۔ پروفیسر جاوید خان: ڈیپارٹمنٹ آف شریعہ، سوات یونیورسٹی

۰۳۔ محبوب الٰہی: لیکچرار شعبہ اسلامیات، ہزارہ یونیورسٹی

۱۳۔ نصر الامن اللہ : لیکچرار، شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ماڈل کالج خار باجوڑ ایجنسی

۲۳۔ ڈاکٹر محمد ایاز: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، زرعی یونیورسٹی پشاور

۳۳۔ ڈاکٹر نسیم اختر: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، شہید بینظیر بھٹو ویمن یونیورسٹی پشاور

۴۳۔ حسین احمد: شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول غنی ڈیری، مالاکنڈ

نشست اوّل: تعارف، پس منظر اور لائحہ عمل

صدارت: خورشید ندیم

استقبالیہ کلمات: محمد عامر رانا

شرکاء کا تعارف، موضوع پر اظہار خیال اور گروپوں کی تشکیل

خورشید ندیم:

جس مقصد کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں وہ مقصد ہے کیا؟ جو ذہنی مشق یہاں کرنی ہے اس میں عقلیت کو پیش نظر رکھنا ہے اسے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند بنانا ہے۔ یہ یہاں پر ہماری شرکت کا بنیادی نقطہ ہے۔ دو چیزیں بہت بنیادی ہیں۔ ایک تو یہ کہ تعلیم اور سماج کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ سماج ہے جو تعلیم کے لیے مقاصد اور اہداف کا تعین کرتا ہے یا تعلیم کسی سماج کے سیاسی، معاشی اور مسائل کو متعین کرتی ہے۔ دونوں میں سے کون ہے جو قیادت کے منصب پر فائز ہے۔ اگر تو یہ نظام تعلیم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اساتذہ اور تعلیمی ماحول کا کردار بنیادی ہے وہ

30-31- مئی کو مری میں ہونے والی دوروزہ تربیتی ورکشاپ کی تصویری جھلکیاں

آگے بڑھ کر سماج کی تربیت کریں اور بتائیں کہ سماجی اور دیگر مسائل کیا ہیں اور آگے بڑھنا ہے تو یہ بھی بتائے کہ کون سے طریقے ہیں جو آگے بڑھائیں گے۔ اور اگر سماج کی قیادت بالغ نظر ہے تو وہ آگے بڑھ کر طے کرے اور بتائے کہ یہ ہمارے مسائل ہیں اور پھر تعلیم ان کا حل پیش کرے۔ دونوں میں سے کون سی ترتیب درست ہے اور ہمیں کہاں سے آغاز کرنا ہے؟ میرا خیال یہ ہے کہ سماج کے کسی متعین جواب کے لیے اگر ایک نظر اپنی تاریخ پر ڈال لیں تو نتیجہ خیز بحث ہو سکے گی۔

انگریزوں کی آمد کے بعد برصغیر کے مسلم سماج کے لیے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اگر اس کو بطور معاشرے کے زندہ رہنا ہے تو کن چیزوں کو اختیار کیا جائے؟ ہمارے بزرگوں نے اس بارے میں تعلیم کے حوالے سے سوچا۔ چار ردِعمل ہمارے سامنے آئے جنہوں نے یہ بتایا کہ مسلم سماج کو اپنے تشخص کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو کن باتوں کو اپنانا ہوگا؟ پہلا ردعمل تو دارالعلوم دیو بند کا تھا۔ جس کا کہنا یہ تھا کہ مسلم شناخت اور تشخص باقی نہیں رہ سکتی اگر ہم اپنے علمی ورثے کے ساتھ تعلق قائم اور مستحکم نہیں رکھ سکتے۔ مسلم سماج کا ایک پس منظر ہے، تیرہ چودہ سو سال کی تاریخ ہے۔ اگر وہ ساری روایات باقی نہ رہیں، نہ نئی نسل کا اس کے ساتھ تعلق رہا تو مسلم سماج کی شناخت باقی نہ رہے گی۔ ہمیں اپنی روایت کو برقرار رکھنا ہوگا، اُس ورثے کی حفاظت کرنی ہوگی جس کو ہم مسلم روایات اور ورثہ کہتے ہیں۔

دوسرا ردِعمل علی گڑھ کا تھا کہ زندگی جامد وجود کا نام نہیں ہے۔ جب یہ آگے بڑھتی ہے تو نئے مطالبات کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر مسلم سماج اپنے عہد کے مطالبات کو نہیں سمجھتا تو اُس کی زندگی برقرار نہیں رہے گی۔ محض سماج سے جڑے رہنے سے زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ اگر زندگی آگے بڑھ رہی ہے، تغیر پذیر ہے تو پھر لازم ہے کہ آج کے عہد کو سوچتے ہوئے، اس میں اپنے لیے ریسپانس تلاش کرنا ہوگا۔

تیسرا ریسپانس وہ تھا جس کو آپ ندوۃ العلماء کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ ریسپانس یہ کہتا ہے کہ مسلم روایات سے تعلق رکھے بغیر مسلم تشخص باقی رہتا دکھائی نہیں دیتا۔ مسلم تشخص کو واضح کرنے کے لیے روایات کی بات کرنا ضروری ہے۔ لیکن روایت بھی اپنے وجود میں جامد نہیں ہوتی

ہے۔ روایات کی زندگی بھی اس وقت تبدیل کی جاسکتی ہے جب وہ اپنے عہد میں اپنے وجود کو ظاہر کرے۔ اگر روایات کسی عہد میں اپنی شناخت برقرار نہیں رکھ سکتیں تو محض روایت کے طور پر وہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ وہ کتابوں اور میوزیم میں رہ جائے گی لیکن زندگی کا حصہ نہیں بن پائے گی۔ اگر روایت اپنے عہد کے ساتھ خود کو مستحکم نہ کر سکے تو اس کا وجود ممکن نہیں رہے گا۔ اس لیے روایت کو زندہ رکھنا ہے تو اس کی تجدید نو کرنا ہوگی۔ اگر روایت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے اس کی تفہیم نو بھی ہو۔ اپنے عہد کی تشریح کا اس کا اطلاق بھی نیا ہو۔

چوتھا ردِعمل جامعہ ملیہ کا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اصل چیز نئے علوم نئے تقاضے ہیں، یہ سب تو ہم نے کرنا ہے لیکن تعلیم کو اپنی روایات کے ساتھ جوڑنا ہے۔ روایت ایک تہذیبی چیز ہے۔ زندگی کو آگے بڑھانا ہے تو پھر ہمیں جدید علوم کو سیکھنا ہوگا اور ان کے اندر مہارت حاصل کرنی ہوگی۔ جامعہ ملیہ بنیادی تعلیمی ادارہ تھا مگر دینی تشخص کا حامل ادارہ تھا۔ ندوۃ العلماء دینی علوم کا ادارہ تھا مگر ایک جدید تشخص کے ساتھ۔ یہ چار ریسپانس ہیں جو تعلیم اور سماج کی باہمی بنیاد کو ظاہر کرنے کے لیے، ہماری روایت میں موجود ہیں۔ جو ہماری ذہنی وفکری قیادت تھی اس نے طے کرنے کی کوشش کی کہ تعلیم میں ایسا کیا کیا جائے جو سماج کے استحکام کی بنیاد بن سکے۔ جامعہ ملیہ قدرے بعد کا ردعمل ہے۔ اس میں بڑی حد تک علی گڑھ اور دارالعلوم دیو بند کے تجربات تھے۔ اس سے جو نتائج سامنے آئے اس کا بھی بڑی حد تک اطلاق اس کے اندر موجود ہے۔ ندوۃ العلماء کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جامعہ ملیہ کا تو آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کا سنگ بنیاد بھی مولانا محمود حسن نے رکھا تھا جو خود دارالعلوم کے مدرس رہے۔ انہوں نے یہ بات گویا سمجھانے کی کوشش کی کہ دارالعلوم دیو بند اور علی گڑھ دونوں مسلم سماج کا پوری طرح ادراک نہیں کر سکے۔ ایک بات کا خیال رکھا گیا تو کوئی دوسرا پہلو ادھورا رہ گیا۔ ایک نے ایک پہلو کو نمایاں کیا تو دوسرے کو نظر انداز کیا اور دوسرے نے دوسرے پہلو کو نظر انداز کیا تو ایک کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے آگے بڑھ کر قدم اُٹھانا ہوگا۔ اور تعلیم کو سماج کی خدمت پر لگا دینا ہوگا۔

جب پاکستان بن گیا تو دو روایات ہمارے ہاں رہ گئیں، ایک علی گڑھ کی روایت اور دوسری دیو بند کی روایت۔ ہمارا حکمران طبقہ علی گڑھ کا امین بن گیا۔ ریاست کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں

تھی اس لیے علی گڑھ کی روایات کو بڑھایا گیا لیکن سماج نے محسوس کیا کہ اس کے لیے یہ کافی نہیں، اس کا دینی تشخص بھی ہے، لہٰذا اس نے اپنی دیو بند روایات کو شامل کیا، گویا یہ سماجی ریسپانس تھا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنے بچوں کو علی گڑھ روایت کی حامل تعلیم دینے میں ترجیح دی۔ تاکہ جدید عہد کے تقاضے پورے کیے جائیں۔ معاشرے اور ریاست نے مل کر کوشش کی توازن برقرار رہے۔ ہمارا تجربہ یہ کہتا ہے کہ یہ انداز کامیاب نہیں ہوا۔ ہمارے ملک کے اندر اس کوشش سے پولرائزیشن ہوئی، ہم نے دو طرح کے لوگ پیدا کیے۔ اور دونوں معذرت کے ساتھ ادھورے پیدا ہوئے۔ دونوں اپنی اپنی طرز میں ماہر تھے دوسرے شعبے کے ماہر نہیں تھے۔ اگر کوئی کسی شعبے میں بڑا آدمی پیدا بھی ہوا ہے تو کسی دوسری تعلیم روایت سے بڑا ہوا ہے۔ دونوں روایتوں نے جو ذمہ داری اپنے سر لی تھی، اُس میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے۔ دین کا علم، اس روایت کو تو زندہ رکھا لیکن اُس روایت کو آگے بڑھانے کے لیے جو کچھ چاہیے تھا وہ پیش نہیں کیا گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم علما کی روایت کو آگے نہیں بڑھا سکے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو دین سے سماج کا تصور ابھرا وہ اس تصور انسان اور تصور سماج سے بہت مختلف تھا جو جدید تعلیمی اداروں سے ابھرا ہے۔ سوشل سائنسز ساری اُسی پر کھڑی ہیں جو تصور انسان کا ہے وہی تصور سماج کا ہے۔ چونکہ جدید سماجی علوم مغرب میں مدون ہوئے، مغرب کا جو تصور انسان اور سماج ہے وہی پھر سماجی علوم میں آگے بڑھا۔ ایک مادی وجود کی بقا کے لیے وہ فرد کی ہو یا اجتماع کی، جو علوم مغرب سے آئے تھے اسی روایت کو آگے بڑھایا گیا۔ مادی وجود کے استحقاق کی بات کی، اخلاقی وجود اور تہذیبی وجود جو تھا وہ بدقسمتی سے ہدف نہ بن سکا۔ اُس کے نتیجے میں بہت سارے تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی مسائل پیدا ہو گئے۔ مذہبی اداروں کا مسئلہ یہ ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، وہ مفاداتی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ جیسا کہ سماج کے اندر ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کسی ادارے کے ساتھ وابستہ ہیں، رفتہ رفتہ کام اہم نہیں رہے گا، وہ ادارہ اہم ہو جائے گا جس کے ساتھ مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ مثلاً آپ ایک تعلیمی ادارہ قائم کرتے ہیں، پیش نظر لوگوں کو تعلیم دینا ہوتا ہے لیکن آپ ادارے سے کوئی مراعات لے رہے ہوتے ہیں، یوں مراعات لینے والا ایک طبقہ وجود میں آ جاتا ہے۔ اس وقت آپ کو لگتا ہے کہ ادارے کو برقرار نہ رکھا گیا تو یہ جو مراعات یافتہ طبقہ ہے اس کی مراعات اس کے

مفادات کا کیا بنے گا؟ تو اس وقت آپ کی ساری تگ و دو اس پر لگ جاتی ہے کہ کسی طرح اس ادارے کی بقا کی ضمانت دی جائے حالانکہ وہ ادارہ فی نفسہ مطلوب نہیں تھا۔ کیونکہ وہ تو بنا ہی اس لیے تھا کہ کسی طرح لوگوں کو تعلیم دی جائے' آہستہ آہستہ لوگوں کی ضرورت کی بقا بن گیا۔ جب مفادات وابستہ ہوتے ہیں تو ایسے گروہ وجود میں آتے ہیں جو وہ انہیں اپنی ترتیب سے چلاتے ہیں۔ دینی تعلیم کے بارے میں بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوا کہ دینی تعلیم کے ادارے جب آگے بڑھے تو ایسے گروہ سامنے آئے۔ وفاق المدارس' تنظیم المدارس' یہ ادارے تعلیم کے لیے وجود میں آئے۔ یہ ادارے خود مطلوب بن گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ جس مقصد کے لیے بنا تھا اس کو پیشِ نظر رکھا جاتا۔ اگر آپ دارالعلوم کی ابتدائی تاریخ پڑھیں اور یہ دیکھیں کہ انہوں نے وسائل کس طرح جمع کیے' آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ اس بارے میں کس قدر حساس تھے کہ وسائل کا معاملہ اس طرح نہ ہو کہ مدرسے کا مہتمم یا خطیب کی معیشت کا دارومدار یا انحصار مدرسہ و مسجد پر ہو بلکہ اس کی معاشی ضروریات کے لیے متبادل انتظام موجود ہو' کہ وہ ادارے میں پڑھانے کے لیے آئے تو تعلیم ہی اس کا مقصدِ اوّل ہو، لیکن یہ نہیں ہوا۔ جب نہیں ہوا تو ایک مراعات یافتہ طبقہ وجود میں آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے میں فکری ابہام پیدا ہو گیا۔ یہ اس لیے ہوا کہ جو رول رکھا' جو اہداف رکھے وہ طے نہ ہو پائے بلکہ اس سے نئے مسائل جنم لینے لگے۔

سماج میں مذہب ایک بڑا عنصر ہے۔ اگر ہم مذہب کو استعمال کریں تو یہ ایک بڑا کردار ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ پاک افغان تعلقات میں مذہب کا بڑا عمل دخل ہے۔ اسی طرح پاک انڈیا تعلقات میں بھی مذہب کا بڑا عمل دخل ہے۔

دوسرا مرحلہ 79ء میں آیا جب افغان جہاد کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اس کے بعد مدارس کو قبولیت عامہ کے لیے استعمال کیا گیا، اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہمیں بخوبی معلوم ہے۔ تو یہ ساری چیزیں دینی ہم آہنگی وغیرہ پس منظر میں چلی گئیں اور جو اصل مقصد تھا کہ انسانوں کو جوڑنا اور انہیں وحدت کی طرف لایا جائے۔

سیرت کا مطالعہ بھی اگر ہوا تو مغازی کے طور پر ہوا اس کا سماجی پہلو پیشِ نظر نہ رکھا گیا۔

آج اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ جائزہ لیا جائے کہ مذہبی

رواداری کے لیے ہماری تعلیم کیا کردار ادا کر رہی ہے؟ امن ایک ایشو بن گیا ہے اور مذہب جو انسان کے لیے دنیا وآخرت میں امن وامان کی ضمانت ہے وہ بدقسمتی سے فساد کے راستے پر چل پڑا ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جس پر آپ کو اور مجھے سوچنا ہے۔

یہ پہلا سوال ہے کہ جس کے تناظر میں ساری گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ سماجی ضروریات کے لیے تعلیم یا دوسرے ادارے خود بخود ان کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج میں جو طلب پیدا ہو رہی ہے وہ بھی تعلیم کی وجہ سے ہو رہی ہوتی ہے۔ اب یہ وضاحت کرنا کہ سماج کی ضرورت کیا ہے یہ ایک اہم ایشو ہے۔ جب ہائیر ایجوکیشن کمیشن بنا تھا تو اس کا مقصد سائنسز اور طبعی علوم کی طرف توجہ دینا تھا۔ اس وقت بھی سماجی علوم کو نظر انداز کیا گیا۔

دوسرا سوال۔

اعلیٰ تعلیم کے اداروں کا سماج کے ساتھ تعلق کیسا ہے؟

یہ ادارے اپنی فیکلٹی تک محدود رہتے ہیں وہ سماج کو سنوارنے میں بھی کوئی کردار ادا کرتے ہیں۔؟

میرا کہنا یہ ہے کہ وہ فیکلٹی سے باہر نہیں نکلتے۔ ہمارا سکالر اپنے علم کو سماجی تعلق کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ اپنی معاشی ضروریات کی طرف اس کی توجہ ہوتی ہے۔

مثلاً ایک پروفیسر کے لیے پانچ پبلی کیشنز ضروری ہیں وہ اسی تگ ودو میں رہے گا کہ کسی طرح یہ پانچ پبلی کیشن پوری ہو جائیں تا کہ اس کی پروموشن کے لیے ماحول میسر ہو۔ اپنے لائبریری کے اوقات میں بھی وہ محدود رہتا ہے۔ سماج کی سٹڈی کے لیے اس کے پاس بہت کم وقت ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے موضوعات کے انتخاب کو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آج کے مسائل کا حل چودہ سو سال پہلے کے ماحول میں تلاش کیا جا رہا ہے۔

حتیٰ کہ اپنے اسلاف کے منہج کو ہی نہیں سمجھ پائے ہیں کہ سارے مسائل سماج کے ساتھ تعلق نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں۔

تیسری چیز جو کرنے کی تھی وہ یہ کہ مدارس میں تحقیق کا کوئی معقول انتظام نہ ہو سکا۔ اس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل طلباء وہ کام پیش نہ کر سکے جو سماج ان سے مطالبہ کر رہا تھا' جب کہ بیرون ملک کے تعلیمی اداروں میں تحقیق کا کام قدرے بہتر ہے جس کے نتائج بھی مثبت آ رہے ہیں۔

جامعات کا کردار سماجی رویّوں کا عکاس ہونا چاہیے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سوشل ورکر بن جائیں بلکہ سماجی سوچ کا ہونا ضروری ہے اگر اہل علم یہ کام نہیں کریں گے تو کم پڑھے لکھے لوگ مختلف جگہوں پر آ کر مذہب اور دین کی تشریح کر رہے ہوں گے۔ جامعات کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سماجی رواداری کے لیے ضروری ہے کہ جامعات نوجوانوں کو سماجی خدمات کے مواقع دیں۔ مواقع دیے بغیر سماجی رویّوں کو پروان نہیں چڑھایا جا سکتا ہے۔

دوسری نشست: مختلف شرکاء کے خیالات کا خلاصہ

☆ رائے: ہمارے معاشرے میں خصوصاً اسلامیات کے اساتذہ کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اگر ان رویّوں کو سماجی سطح پر لانا ہے تو اسلام کی مقدس تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔

اُستاد' استاد ہوتا ہے چاہے اسلامیات کا ہو یا کسی اور مضمون کا۔ پرانے استاد اپنے کردار سے پہچانے جاتے تھے۔ استاد اپنی شکل وصورت سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ سماج میں اپنے رویّوں سے اس کی پہچان ہوتی ہے۔ استاد کو بطور معلم کے دوسروں کیلئے سوچنا ہوتا ہے۔

☆ ورکشاپ کا بنیادی سوال طے ہو جانا بہت ضروری ہے۔

میرے خیال میں دونوں جانب سے کوتاہیاں ہیں۔ مجھے ملائشیا جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہاں کی حکومت ہر سطح پر اپنے لوگوں کی رہنمائی کر رہی ہے۔ میں بھی مدرسے کا پڑھا ہوا ہوں لیکن کچھ چیزوں کی تشریح ابھی تک درست انداز میں نہیں کی گئی ہے۔

اولاً

سماج اور تعلیم کا باہم تعلق کیا ہے۔ کیا یہ سماج ہوگا کہ جو ہمیں بتائے گا کہ کون سی تعلیم ہمیں حاصل کرنی ہے؟ ہم سماج کو کب اور کیا پڑھائیں گے۔ جامعات کی تحقیق کا سماج کے ساتھ تعلق

ہمارے سامنے ہے کہ کس قسم کی تحقیق کو ہم ترجیح دیتے ہیں۔

☆ پیشے میں آنے کی وجہ معاشی مسائل ہوتے ہیں' اچھے پیسے جہاں سے ملتے ہیں اس پیشہ کو جوائن کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں چاہے گھر ہو یا کوئی دوسرا شعبہ' طلباء کو اس طرف راغب کرتے ہیں کہ جہاں پیسے زیادہ ملیں اس شعبہ کا اختیار کیا جائے۔ دوسرا ہم نے اپنے سماجی رویّوں کو علیحدہ نہیں کیا۔ یعنی بعض رویّے ایسے ہوتے ہیں جو براہ راست طلب علم سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض رویّے سماج کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ تعلیم سے متعلق رویّوں کو علیحدہ کرنا چاہیے۔ استاد غیر ضروری چیزوں میں اپنے آپ کو ملوث کرتا ہے۔ اس سوال کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ استاد کی عدم دلچسپی سے سماج میں بہتری آ ہی نہیں سکتی۔ یعنی معیاری اساتذہ کا فقدان ہے۔

☆ مدارس سے منافرت پھیل رہی ہے وہ اس طرح کہ مدرس اپنے طالب علم کو یہ کہتے ہیں کہ اہل حدیث اس طرح کہتے ہیں اور دیوبند اس طرح کہتے ہیں' بریلوی اس طرح کہتے ہیں۔ تو اس طریقے سے دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر وہ منافرت کو طالب علموں میں منتقل کر رہا ہوتا ہے۔ اختلاف اپنی جگہ پر لیکن محبت کا دامن تھامے رکھیں۔

قرآن کے نظام تعلیم اور سماجی تعلیم میں ہم آہنگی کو رواج دیں۔

ٹیچنگ عام طور پر وہ افراد کرتے ہیں جن کے لیے سماج میں کوئی دوسری ملازمت کی گنجائش نہ ہو اس لیے اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ایک اور مسئلہ: میں اپنی کلاسوں میں طلباء سے پوچھتا ہوں کہ تم تعلیم کی طرف کیوں آئے۔ ان میں سے اکثر کا جواب، روزگار یا والدین کے کہنے کی وجہ سے آنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں بچوں کا کم جب کہ بڑوں کا قصور زیادہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کو تعلیم کے مقصد سے آگاہ کریں۔

نظام تعلیم کو سماج کے فائدے کے لیے استعمال کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے جو کہ وہ نہیں کر رہی۔ مثال کے طور پر خیبر پختونخواہ ٹیکسٹ بک کمیٹی نے 7ویں جماعت کے لیے کورس بنانے کا کہا تو میں نے کہا یہ مشکل کام ہے تو انہوں نے کہا یہ آپ کو کرنا ہوگا۔ سو میں نے محنت کر کے ایسا کیا لیکن کمیٹی نے اسے دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا صرف اتنا کہا کہ کچھ تصاویر کا اضافہ کریں۔

☆ بڑوں کی ذمہ داری بنتی ہے اور اساتذہ کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ چھوٹوں کو اس بارے میں بتائیں۔

☆ بحیثیت استاد ہم اپنے فرض کو سمجھیں' سماج کے ساتھ ہمارا تعلق کیسا ہونا چاہیے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میری زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلے جو فرقہ واریت کا باعث بنے۔ سماجی مسائل کا ادراک اور اس کا حل ضروری ہے۔

☆ سب سے پہلے مسئلہ نظام تعلیم اور ہمارا سماج ہے۔

☆ مختلف نظام تعلیم سے بھی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ بیکن ہاؤس کا پڑھا ہوا اور ذہن کا مالک ہوتا ہے' سرکاری اداروں میں پڑھا ہوا مختلف ذہن کا مالک ہوتا ہے۔ جب ہم روایات کی بات کرتے ہیں تو لامحالہ ہمیں نظام تعلیم کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کیونکہ نظام تعلیم سے معاشرہ وجود پاتا ہے۔

☆ اداروں کا آپس میں تعاون نہ ہونا' ہم آہنگی کا فقدان۔ مثال کے طور پر عدلیہ اور انتظامیہ کے درمیان تصادم نظر آتا ہے' کوارڈینیشن نظر نہیں آتا۔

☆ سوشل اور مذہبی ہم آہنگی کیسے پیدا کریں۔ اس مقصد کے لیے ورکشاپ کا انعقاد کیونکہ جو چیزیں ہم ورکشاپ اور کانفرنسوں سے سیکھتے ہیں وہ عموماً کتابوں سے نہیں سیکھ پاتے۔ ہمارے ہاں ورکشاپس اور کانفرنسوں کی کمی دیکھنے میں آئی ہے۔

☆ انگریزی تعلیم اور اسلامی تعلیم

مدارس کے اکثر فضلاء کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے مستقبل میں کیا کرنا ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جدید تعلیم اور دینی تعلیم کا یکساں نصاب تعلیم ترتیب دیا جائے۔

☆ ترجیحات کی تبدیلی

مثال کے طور پر آپ ٹیبل پر بیٹھے ہیں۔ کوئی اور صاحب آتے ہیں تو آپ اس کو بیٹھنے کے لیے جگہ دیتے ہیں۔ اسی طرح گاڑی میں سفر کرتے ہوئے بھی آپ فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

داؤد غزنوی جو کہ اہل حدیث تھے' مولانا احمد علی لاہوری نے اپنے مقتدیوں کو بتایا ان کے

احترام میں جبراً آمین نہ کہا جائے جب کہ داؤد غزنوی نے احمد علی لاہوری کے احترام میں جبراً آمین نہ کہا۔ یہ ہے احترام معاشرہ۔ اپنے حقوق کو ادا کریں، دوسروں سے اپنے حقوق نہ مانگیں۔

☆ تیسری نشست: گروپ رپورٹس اوران پر بحث

صدارت: عمار خان ناصر (مذہبی سکالر، الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ)

گروپ اے کی رپورٹ

ڈاکٹر محمد ظاہر شاہ (پروفیسر وسربراہ شعبہ عربی، پشاور یونیورسٹی)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں تین چیزوں کا فقدان ہے۔ رویّوں کے مسائل ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تعلیم نظام ہمارا درست نہیں ہے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ مسائل کے حل کا ذریعہ قرآن مجید ہے۔ اگر ہم قرآن کو صحیح طریقے سے پڑھیں، اور سمجھیں تو یہ مسائل جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں اور جو مشکلات ہیں وہ ختم ہو جائیں۔ نظامِ تعلیم کے اندر رحمانیت کی صفت ہونی چاہیے۔ دین نے فرد کی اہمیت پر زور دیا۔ جب معاشرے کے اندر فرد کے اوپر قدغن لگا دیں تو مسائل پیدا ہوں گے۔ معاشرہ اُس وقت صحت مند رہے گا اگر ہم قرآن کا درست مطالعہ کریں۔ اس کے ساتھ ہر وہ ریسرچ جس کا مطمع نظر مسئلے کا حل نہ ہو، وہ ریسرچ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم میں وہ لوگ آتے ہیں جن کو کوئی اور ملازمت نہیں ملتی۔ اگر نا اہل تعلیم کی طرف آئیں گے تو یہ قیامت کی نشانی ہوگی۔

تربیت کا نظام

کتنے والدین ہیں جو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر پریشان ہوتے ہیں۔ سماجی مسائل کا ادراک۔ انسان سماجی جانور ہے۔ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو سماجی مسائل پر سوچتے ہیں اور اس کا حل سوچتے ہیں؟ ہمیں پتا ہی نہیں چلتا کہ ہمارے سماجی مسائل کیا ہیں۔

یکساں نظام تعلیم کا فقدان

ہمارا یہ بھی مسئلہ ہے۔ تعلیم میں یکساں نظام نہیں۔ اس کے ساتھ مسٹر اور ملا کا فرق۔

جب ہم نے اختلاف کے وجود سے انکار کر دیا تو مسائل پیدا ہوئے۔ اختلاف کے دوران اختلاف کرنے والے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے بہت سے سماجی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہماری حکومت نے اسلامیات اور دینی تعلیم کی پروموشن کے لیے تین اساتذہ مقرر کیے۔ ایک اسلامیات کا ٹیچر، ایک عربی کا ٹیچر، ایک قاری۔ لیکن بدقسمتی سے ایک سٹوڈنٹ جب پڑھ کر نکلتا ہے تو اس کو نماز جنازہ بھی نہیں آتی۔ اس طرح ہر آدمی استاد نہیں ہوسکتا۔ استاد کی اسلام نے تین صفات بیان کی ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ استاد بچوں کو مبہم طریقے سے نہ پڑھائے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے سمجھائے۔ اس میں حکمت ہونی چاہیے۔ اس کو پتا ہونا چاہیے کہ وہ جو سیکھ رہا ہے اس کو سماج میں کہاں کہاں لاگو کرنا ہے۔ اگر استاد نے اپنے پیشے سے انصاف نہ کیا تو معاشرہ اور تاریخ اس کو معاف نہیں کریں گے

تعلیم اور ہنر میں فرق

ہنر اور علم میں کیا فرق ہے۔ آج کل ہر چیز علم ہے، ہنر نہیں ہے۔ ہر چیز کو علم کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہمیں عدم برداشت پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ خوفِ خدا ہمارے اندر ہونا چاہیے۔ اپنے حقوق کو ماننا اور نہ دوسروں کے حقوق کو نہ ماننا، یہ بات اختلاف پیدا کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ خوف کی وجہ سے بھی ہمارا نظام متاثر ہے۔ خوف کی وجہ سے تحقیق کا عمل خراب ہوتا ہے۔ تحقیق کے لیے تنقید ضروری ہے اور تنقید مفقود ہے۔ تنقید کا مطلب یہ نہیں تنقید برائے تنقید ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں فکری جمود بھی ہے۔

جب ہم کسی نشست میں کوئی موضوع متعین کر کے بیٹھتے ہیں تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس خاص نقطے پر فوکس کر کے زیادہ سے زیادہ اس کی گہرائی تک پہنچا جائے۔ ہماری اس ورکشاپ کا بنیادی موضوع ہے، ہم سمجھنا چاہ رہے ہیں، ہمارے معاشرے میں بہت مسائل ہیں، لیکن یہاں ہم نقطوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جن میں سے ایک تو سماجی ہم آہنگی ہے، کہ اس کے مظاہر کون

سے ہیں تا کہ سماجی ہم آہنگی کو قائم کر کے معاشرے کو خوب صورت بنایا جائے۔اس کے علاوہ دوسرا نقطہ یہ ہے کہ مذہبی عدم رواداری کو سمجھا جائے۔اس سے جو عدم برداشت پیدا ہو رہی ہے،اس کو جانا جائے۔اپنے مشاہدات سامنے رکھیں جائیں۔تا کہ ہم ان مسائل کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔یہی اس نشست کا خاص موضوع ہے۔ہمیں مطلوب یہ ہے کہ مسائل کی نشاندہی کے ساتھ تجاویز بھی پیش کریں۔تحقیق کے کلچر میں جو مسائل ہیں وہ بھی ہمارے معاشرے کا مسئلہ ہے۔لیکن اس نشست میں جانیں گے کہ عدم برداشت کے حوالے سے ہمارے اساتذہ کے مشاہدات کیا ہیں اور ان کی تجاویز کیا ہیں،اس کو سامنے رکھیں۔

سوالات وآراء

خورشید ندیم

دُنیا میں ہر آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ وہ حق کی طرف ہے،جب ہم مذہب کی بات کرتے ہیں،تو ہر مذہب کا ماننے والا اپنے مذہب کو حق سمجھ کر اس پر قائم ہے۔حق واحد ہوتا ہے؟اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ایک حق کئی شکلوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔حق کا ایک پہلو ہماری گرفت میں آئے اور ممکن ہے اس کا دوسرا پہلو کسی دوسرے کی گرفت میں آجائے۔اس پر اگر بات ہو جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔

اس پر بڑی اچھی گفتگو ہو سکتی ہے۔دیکھیں حق ایک ہی ہوتا ہے۔حق کو بین بین دیکھنا چاہیے۔ممکن ہے ہم سب اس کو نہ سمجھ رہے ہوں۔رواداری پر ہم غور کر رہے ہیں تو عدم رواداری پر بھی غور کریں۔سماجی ہم آہنگی کے حوالے سے بات ہونی چاہیے اور اس کے مظاہر بیان ہوں۔ہم کس کو حق سمجھتے ہیں اور کس کو حق نہیں۔ہمارا تعلیم نظام اس میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر خدیجہ عزیز: اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اسلامیات،شہید بینظیر بھٹو ویمن یونیورسٹی پشاور
میں ظاہر شاہ کی بات پر اپنی رائے دینا چاہوں گی۔انہوں نے کہا کہ ہنر اور علم میں ہم آہنگی ہونی چاہیے۔میں بتانا چاہتی ہوں کہ علوم کے اندر بھی ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ایک سبجیکٹ اور دوسرے سبجیکٹ کے اندر ہم آہنگی ہو۔میں ایک ذاتی مشاہدہ شیئر کرنا چاہوں گی۔دو ہزار گیارہ میں میری

پی ایچ ڈی میں سلیکشن ہو رہی تھی،میں نے ایک موضوع کا انتخاب کیا تو جب اس پر بات ہوئی تو کہا گیا کہ اسلامیات کا آدمی اس پر کام نہیں کر سکتا کہ یہ سوشیالوجی کا موضوع ہے،کسی نے کہا کہ یہ سوشل ورک کا موضوع ہے۔تو میں سمجھتی ہوں کہ جس طرح علم اور ہنر میں باہمی تعلق ہوا سی طرح سبجیکٹ کا دوسرے سبجیکٹ سے تعلق ہو اور ہم آہنگی ہو۔یعنی علوم کے اندر ہم آہنگی ہو۔یعنی علوم کے اندر اتنی ہم آہنگی ہو کہ وہ ہر موضوع پر بات کر سکے۔تحقیق کر سکے۔

محمد سعید خان: اسسٹنٹ پروفیسر،اسلامیات،گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج کرک
اس گروپ میں ضروریات اور خواہشات پر جو نقطہ اٹھایا گیا تھا اس کی توجیح کرنی ہوگی۔کیسے خبر ہوگی کہ یہ ضرورت ہے اور یہ خواہش ہے۔اگرچہ پہلے خواہش پیدا ہوتی ہے پھر ضرورت جنم لیتی ہے۔انسانی زندگی سے خواہشات کو منہا کر دیا جائے تو بھی درست نہیں ہے۔یہی فرق ہے انسانوں اور جانوروں میں۔انسان میں اللہ نے یہ خاصیت رکھ دی کہ وہ مطمئن نہیں ہوتا۔انسان کی جبلت کے اندر یہ چیز ہے۔

غلام مصطفیٰ: لیکچرار شعبہ اسلامیات،گورنمنٹ ڈگری کالج یکہ غنڈ مہمند ایجنسی
حق کے بارے میں یہ ہے کہ کون سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن سے ہم حق کو واحد کے طور پر بیان کر سکتے ہیں۔مثال کے طور پر اس کے لیے عقائد ہیں۔ہمارے عقائد میں ہے اللہ ایک ہے،اسی طرح جہنم و جنت کے بارے ہمارے تصورات ہیں۔حق دو بھی ہو سکتے ہیں ایک فریق اپنی تحقیق اور اپنی روایات سے جو چیز لے رہا ہے،اُس کے لیے وہ حق ہے اور دوسرا فریق اپنی تحقیق اور روایات سے جو چیز لے رہا ہو،ہو سکتا ہے وہ اس کا حق ہو۔یوں دو حق ہو سکتے ہیں۔حق کا تعین بھی ہونا چاہیے۔

حق کے حوالے سے میں اگر یہ بات کہوں کہ حق ایک ہے یا دو ہیں اور حق کا تعین کیسے ہوگا۔آدم کی تخلیق پر خدا نے شیطان سے کہا کہ سجدہ کرو تو اس نے انکار کر دیا۔اس کے پاس اپنا حق تھا۔دیکھیں مذہب کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔مذہب ہی حق کا تعین کرتا ہے کہ کیا سچ ہے اور کیا سچ نہیں ہے۔دوسری بات خواہشات اور ضروریات کی بات ہے۔فقہ نے ضرورت کا قاعدہ

مقرر کیا ہے۔کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ انسان سے خواہشات کو محدود کر دیا جائے۔انسان کا بنا ہوا قانون اپنی خواہش کے تابع ہوتا ہے۔دوسرے کا حق مارا جاتا ہے لہٰذا الٰہی قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے۔

گروپ بی کی رپورٹ

قیصر بلال (لیکچرار، شعبہ اسلامیات، فاسٹ نیشنل یونیورسٹی پشاور)

مذہبی اور دیگر اداروں کے مابین فاصلے اور ہم آہنگی کا فقدان ایک وجہ ہے۔جس سے بہت سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور ابہامات جنم لے رہے ہیں۔دوسرا مسئلہ بہترین اساتذہ کا فقدان ہے۔اساتذہ کی تربیت نہ ہونے کے برابر ہے۔یہ فیکٹر مسائل پیدا کر رہا ہے۔ہمارے ہاں ٹیچر اپنی خواہش کی پیروی میں نہیں بنتے بلکہ اتفاق سے بن جاتے ہیں۔کچھ ہمارے سسٹم میں خرابیاں ہیں کہ ہم ایسی پابندیوں میں جکڑ جاتے ہیں کہ مواقع ختم ہو جاتے ہیں۔سیاسی دراندازی بھی ایک وجہ ہے۔اس کے علاوہ علماء کی جدید ذرائع ابلاغ سے عدم واقفیت بھی ایک وجہ ہے۔کچھ روایتی طرز کے جو ہمارے علماء ہیں وہ جدید ذرائع ابلاغ کی کچھ چیزوں سے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ یہ جدید ذرائع ابلاغ ہمیں بدی اور گناہ کی طرف لے جا رہے ہیں۔سماجی ہم آہنگی سے متعلق لٹریچر کی کمی ہے۔ہم نے لوگوں سے کبھی سنا ہے اور نہ کہیں پڑھا ہے کہ سماجی ہم آہنگی کیا چیز ہے اور یہ کیسے ممکن ہے۔اس طرح مذہب سے عدم واقفیت بھی مسائل کو جنم دے رہی ہے۔ہمارے پاس جو کچھ ہوتا ہے ہم اس کو درست سمجھتے ہیں۔اپنا عقیدہ اچھا لگتا ہے اور دوسرے کا عقیدہ برا لگتا ہے۔یہی عدم واقفیت ہمیں مذہبی ہم آہنگی پیدا نہیں کرنے دے رہی۔اگر ہم عدم واقفیت کی وجوہات کا جائزہ لیں تو اس کی وجہ سے مذہبی ہم آہنگی کی بحث ابھی شروع ہی نہیں ہوئی۔اس کے علاوہ معاشرے میں تفریق کا فروغ ہے۔اس کے ساتھ ساتھ خوف سے بھی بچنا چاہیے۔ہم کچھ چیزوں سے خوف کھاتے ہیں،ان کے استعمال سے ڈرتے ہیں کہ اگر اس چیز کو گھر لے آئے تو اس کا غلط استعمال ہوگا۔یہ ہمارا احساس بنا ہوا ہے،اس احساس کو بھی ختم کرنا ہوگا۔علاوہ ازیں میڈیا پر کوئی روک ٹوک کا نظام نہیں ہے۔پیمرا تو موجود ہے مگر یہ بھی مؤثر نہیں ہے۔ٹی وی پر دین کی

تعلیم وہ دے رہے ہوتے ہیں جو دین کی پوری تعلیم سے خود واقف نہیں ہوتے۔اسی طرح سوشل میڈیا ہے۔ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری نسل سوشل میڈیا سے کیا سیکھ اور سمجھ رہی ہے اور اس کی کس طرح برین واشنگ کی جا رہی ہے۔جو کچھ سوشل میڈیا پر دیا جا رہا ہے وہ کس حد تک شفاف ہے۔اس پر بھی ہمیں نظر رکھنی ہوگی۔میڈیا اپنی ریٹنگ کی وجہ سے کچھ چیزوں کو درست قرار دے رہا ہوتا ہے۔یہاں سے کنفیوژن پیدا ہو جاتی ہے۔ہمیں اس پر بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ہمارے نوجوان زیادہ وقت سوشل میڈیا پر لگاتے ہیں جبکہ وہ لائبریریوں میں نہیں جاتے۔یہ کچھ مسائل ہیں جن کا اظہار کیا ہے اور کچھ تجاویز ہیں جیسے عصری اور دینی اداروں کا ایک دوسرے کو برداشت کرنا،اساتذہ کی معیاری تربیت کرنا،اختلافی مسائل کو سماج کے سامنے رکھنا،اختلاف برائے اختلاف سے اجتناب کرنا ہوگا،اہلِ علم کے سلیقہ اختلاف کو سمجھنا،حکومت کو بعض معاملات میں علماء کو اعتماد میں لینا چاہیے۔

خورشید ندیم

میں بات کا آغاز اس لیے بھی کرنے جا رہا ہوں تاکہ یہ بحث آگے کی طرف بڑھے۔دو چیزیں ہیں۔جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں جدید چیزوں سے استفادہ کرنا چاہیے تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔عام طور پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ علوم عالیہ ہیں۔ان کو سیکھیں تو ہم جدید ہو جائیں گے۔مثلاً زبان سیکھ لیں وغیرہ۔کیا جدید کا مطلب یہی ہے کہ جو دنیا کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر ہے جس کو ہم مانتے چلے آ رہے ہیں تو جدید آلات کی مدد سے اس کی تشہیر کر سکیں۔یا اس سے مراد یہ ہے کہ جدید علوم کے باب میں ہمارے سامنے جو چیزیں سامنے آ رہی ہیں،سوشل سائنسز میں سامنے آ رہی ہیں،یا دیگر جو چیزیں سامنے آ رہی ہیں تو ان جدید چیزوں کو ہم نے اپنے نظام فکر میں،اپنے نظریے میں سمونا ہے۔تو جب ہم جدید کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اپنے آپ کو جدید بنانا چاہتے ہیں تو اس سے کیا مراد لی جائے؟

دوسری چیز جو سامنے آئی اس میں سماجی ہم آہنگی اور مذہبی ہم آہنگی میں اساتذہ کا کردار۔اس ضمن میں کوئی ٹھوس تجویز سامنے نہیں آ پائی۔اساتذہ کے کردار کو جب ہم دیکھتے ہیں تو

اس کا اہم کردار تو کمرہ جماعت میں ہوتا ہے۔ اساتذہ کے پاس جو بچے پڑھتے ہیں تو وہ کن خطوط پر ان کی تربیت کریں کی جب وہ پڑھ کر اپنے محلے، گھر یا مسجد میں جائیں تو وہ کس طرح کا رویہ وہاں روا رکھیں کہ سماجی و مذہبی ہم آہنگی قائم ہو سکے۔ کلاس روم میں جب شیعہ سنی، عیسائی اور ہندو لڑکے بیٹھے ہیں تو اس ماحول میں استاد کیا کردار ادا کرسکتا ہے کہ جب طالبِ علم سماج میں آئیں تو وہ اس تعلیم جو سماجی ہم آہنگی کے ضمن میں پڑھائی گئی تھی اس کا مظاہرہ کرسکیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ طالبِ علم کوئی سوال اُٹھا دیتا ہے مثال کے طور پر جیسے خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ تو اس حوالے سے استاد کس طرح معاملہ کرے کہ مذہبی ہم آہنگی کو قائم کرنے کے لیے وہ اپنا کردار ادا کر سکے۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ مذہبی و سماجی ہم آہنگی میں اساتذہ کا کردار کیسے بنتا ہے؟ اس کو ہم ٹھوس حالت میں ابھی واضح نہیں کر سکے۔

خدیجہ عزیز:

چونکہ جدید ذرائع ابلاغ کی بات میں نے کی تھی، تو اس کی تھوڑی توضیح کر دوں۔ اگر کوئی مغرب میں بیٹھ کر خدانخواستہ قرآن و اسلام کے حوالے سے توہین آمیز صورتحال سوشل میڈیا یا جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے کرتا ہے، تو ہم یہاں پاکستان میں بیٹھ کر مشتعل ہو کر اپنی املاک کا نقصان نہ کریں۔ بہتر تو یہ ہے کہ ہم بھی سوشل میڈیا اور فیس بک کا استعمال کر کے اس کا مؤثر جواب دیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی پرنٹ یا الیکٹرانک میڈیا پر ہمارے اوپر تنقید کر رہا ہے تو ہمیں بھی انہی ذرائع کا استعمال کر کے اپنا دفاع کرنا چاہیے اور مدلل جواب دینا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے اور دین کی اصل تعلیمات کے فروغ کے لئے بھی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو استعمال میں لائیں۔

غلام مصطفیٰ: لیکچرار شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج یکہ غنڈ مہمند ایجنسی

خورشید ندیم کا سوال یہ تھا کہ سماجی ہم آہنگی اور مذہبی ہم آہنگی میں اساتذہ کا کردار۔ اس ضمن میں کوئی ٹھوس تجویز سامنے نہیں آ پائی۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ اسلام کی ایسی تشریح کی گئی کہ کچھ کے اندر عدم برداشت اتنا زیادہ ہے کہ وہ قتل و غارت گری کی طرف مائل ہو گئے۔ اسلام کی

علمی تشریح نہیں کی گئی۔ جس نے جو سمجھا اس نے کہا یہی اسلام ہے۔ اسلام کی درست تشریح ہونی چاہیے اور جو قابل لوگ ہیں وہ اس تعلیم کی طرف آئیں۔ جو لوگ ہم سے جدا ہو گئے ہیں یعنی عسکریت پسند بن گئے ہیں، ان کو اسی طرح مکالمے کے ذریعے مین سٹریم میں لانا ہوگا۔

جامعات کے اساتذہ مذہبی ہم آہنگی کے لیے کیا اقدامات کر سکتے ہیں۔ پہلا نقطہ تو یہ ہے۔ اصطلاحات سے اجتناب کرنا۔ (کچھ اصطلاحات ایسی ہوتی ہیں جن کے برملا اظہار سے مسائل جنم لے سکتے ہیں لہٰذا ایسی اصلاحات سے اجتناب کرنا چاہیے۔) بچے کی سماجی صلاحیتوں کو والدین کے ساتھ شریک کرنا۔ (کچھ بچوں کے اندر ایسی صلاحیتیں ہوتی ہیں کہ وہ سماج میں بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اساتذہ اور بچے کے والدین مل کر ایسی صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔) انسانی سرگرمی کو فعال بنانا۔ (اساتذہ صرف کلاس روم کی سرگرمیوں تک محدود نہ رہیں بلکہ انسانی سرگرمیوں میں فعال کردار ادا کریں، تمام طرح کے نصاب میں انسانی سرگرمیوں پر مبنی تحریریں ہونی چاہئیں۔

گروپ سی کی رپورٹ

محمد نواز صافی: لیکچرار، شعبہ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی

سماجی ہم آہنگی کی ضرورت اس لیے ہے کہ معاشرے میں امن کو ضروری بنایا جائے۔ اسی طرح مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دے کر بھی امن کی طرف بڑھا جا سکتا ہے۔

سماجی ہم آہنگی ایک وسیع اور عمومی بحث طلب موضوع ہے۔ ہم نے ہم آہنگی کے لیے چند مسائل سامنے رکھے ہیں۔

پہلا مسئلہ: ریاست اور رعیت کے مابین ہم آہنگی کا فقدان، اس کی مثال یہ ہے کہ آج تک ریاست اور رعیت کے مابین تعلق درست طریقے سے قائم نہیں ہو سکا، اس کی وجہ ریاست کی پالیسیاں ہیں۔ چاہے وہ داخلی ہوں یا خارجی، ہماری ریاست نے جو پالیسیاں اس ضمن میں وضع کی ہیں، وہ اتنی مبہم ہیں کہ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی کلیئر نہیں ہو پاتیں، یوں دونوں کے مابین فاصلے بڑھے ہیں۔

دوسرا مسئلہ: ریاست اور اداروں کے مابین نیز وفاق اورصوبوں کے مابین ہم آہنگی کا فقدان، ریاستی ادارے ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں، ہرادارہ اپنے تئیں خودمختار بنا ہوا ہے۔

تیسرا مسئلہ۔حکومت کو ہر چیز کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

چوتھا مسئلہ: یکساں نظامِ تعلیم کا فقدان، ہمارے ہاں ایک دنیاوی اور ایک دینی نظام تعلیم ہے۔ مذہبی تعلیم اور دنیاوی تعلیم دونوں میں یکسانیت نہیں ہے۔ پھران نظاموں میں ایک ایسی دیوار حائل ہے جو مسائل پیدا کررہی ہے۔حکومت کی عدم توجہی ہے۔

پانچواں مسئلہ: منجمد خیالات اور تصورات، ہمارے خیالات میں جمود ہے۔ہم سیکھتے ہیں جو سیکھا اور سمجھا ہوا ہے تو اس کو حرف آخر سمجھتے ہیں۔

چھٹا مسئلہ: اساتذہ کا کردار، اساتذہ کا کردار ہم آہنگی کے لیے وسیع ہے۔صرف اسلامیات کے اساتذہ ہی نہیں تمام مضامین کے اساتذہ اس میں آتے ہیں۔ ہمارے ہاں نصاب کو اس طرح ترتیب نہیں دیا گیا کہ استاد اپنی طرف سے کچھ پڑھا سکے۔جو کچھ دیا گیا ہوتا ہے استاد اس کو پڑھاتا ہے۔ایک معتدل نصاب تعلیم ہونا چاہیے۔

ساتواں مسئلہ: سیمینارز کا انعقاد، اس طرح کی ورکشاپ ہوں، جس میں اساتذہ سیکھ سکیں۔جبکہ ایسے سیمینارز کا فقدان ہے۔

تجاویز: مسٹر اور ملا کے مابین دیوار گرائی جائے۔مختلف مذاہب کے لوگوں کے مابین مکالموں کا انعقاد کیا جائے۔اساتذہ کے لیے تربیتی پروگرام کا انعقاد۔ پڑوسی ممالک اور عالمی دنیا کے ساتھ تعلقات واضح اور اچھے ہوں۔

رائے

موضوع یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کو سماجی ہم آہنگی اور مذہبی عدم رواداری کا سامنا ہے۔افسوس کے ساتھ کہنا یہ پڑتا ہے کہ عدم رواداری اور عدم ہم آہنگی ہمیں اس وقت یاد آتی ہے جب اس کے مظاہر سامنے آتے ہیں، جب منافرت پھیلتی ہے، اور اختلاف رائے سے مسائل

شروع ہوجاتے ہیں۔اس کے علاوہ ہمارا خیال ادھر نہیں جاتا۔حکومت کے جو ذمہ دار لوگ ہیں وہ اس طرف بروقت توجہ نہیں دیتے۔ یہاں تصادم ہیں، نقطہ نظر میں بھی اور خیالات میں بھی۔ ہمارا معاشرہ ان ایشوز سے محروم ہے جن سے وہ معاشرہ بن نہیں رہا۔ہمارے ہاں توانائیاں ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلنے کے لیے صرف ہوتی ہیں ایک دوسرے کو آگے بڑھانے کے لیے نہیں ہوتیں۔اگر مقصد ہمارا اشتراک اور اتحاد ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ ہمیں ایک طویل المدتی حکمت عملی بنانا ہوگی۔بڑی تعداد میں فکری تضادات ہمارے ہاں موجود ہیں۔ پہلے تو ان کو سمجھانے کے لیے ایک ماحول بنانا چاہیے۔ ہر طبقے کو پہلے یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ بھائی جو تمہارا نقطہ نظر ہے، وہ ایک پوزیشن ہے۔افہام وتفہیم اور مکالمے کا یہ عمل شروع ہو۔جب یہ عمل ایک مدت چلے گا تو مسائل کے حل کا سلسلہ چلے گا۔ ہمیں نسخہ کیمیا کی جگہ ایک ماحول کشید کرنا ہوگا۔لوگوں کے اندر یہ شعور پیدا کرنا ہے کہ ہم نے خود مسائل حل کرنے ہیں، کوئی معجزہ نہیں ہونا۔ جب ہم مکالمے اور افہام وتفہیم کو اپنائیں گے تو اساتذہ کی اہمیت اجاگر ہوگی۔قوم جب کسی کی طرف دیکھتی ہے تو وہ استاد ہوتا ہے۔ یہاں میں استادوں کے مابین تفریق نہیں کر رہا کہ وہ فلاں مضمون کا ہے یا مدرسے کا۔ یہاں اساتذہ کو کرنا کیا ہے؟ ہم جو برداشت اور مکالمے کا رویہ لوگوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں پہلے خود میں کریں۔ہم چاہتے ہیں کہ لوگ بااخلاق ہوں، تو پہلے اساتذہ کو ایسا ہونا ہوگا۔ جتنا انسان کردار کو دیکھ کر سیکھتا ہے، وہ کسی اور رشتے سے نہیں سیکھتا۔اختلاف ہماری سوسائٹی کا حصہ ہے۔ایک استاد ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری زیادہ بڑھتی ہے، استاد کا کام تربیت دینا ہے۔نہ کہ اس کو ایک نقطہ نظر کا اسیر بنانا ہے۔

چوتھی نشست: کلیدی خطبات

صدارت: خورشید ندیم (محقق، دانشور و کالم نگار)

مقررین: ڈاکٹر قبلہ ایاز، ڈاکٹر خالد مسعود

عنوان: پاکستان کا سیاسی وسماجی منظرنامہ اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا کردار

مقرر: ڈاکٹر قبلہ ایاز

یہ موضوع اور اس پر بات کرنے کے لیے جو پورا منظر نامہ ہے۔اس کے لیے ہمیں پاکستان کی تاریخ کی طرف جانا ہوگا،شاید کچھ باتیں ایسی آجائیں جو اپ کے لیے ناخوشگوار ہوں۔علمی محفلوں میں ہمیں ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے کہ کچھ چیزوں کو قبول کرنا چاہیے،ہم ایک لمبے عرصے سے ایک بیانیے پر ہیں،کبھی ہمیں ضرورت پڑتی ہے کہ ہم ذہنی طور پر تیار ہوں کہ کچھ چیزوں کو از سرِنو سمجھنے کی کوشش کریں۔کچھ باتیں اگر آپ کو نا آشنا لگیں تو میں پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔اس یقین کے ساتھ جو کچھ کہوں گا مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ یہی سچائی ہے۔بلکہ عین ممکن ہے جو میں نے نتائج اخذ کیے ہیں وہ از سرِنو قابلِ غور ہوں۔اگر دلیل مجھے مل جائے تو میں اپنے نظریات میں تبدیلی لے آؤں گا۔ابتدا ہی سے ہمارا بیانیہ بھارت کی مخالفت پر بنا۔تقسیم کے لیے اساسی نقطہ یہ تھا کہ دونوں جدا تہذیبیں یکجا نہیں رہ سکتیں یہ دلیل بعد میں دو نقطہ کی حامل ہوئی۔ظاہر ہے جس دلیل پر پاکستان بنا ہے اسی کو آگے بڑھانا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جو چیز شروع میں ہمارے ساتھ شامل ہوگئی وہ تھی افغانستان۔ان کے بارے میں ایک قسم کی غلط فہمی،خوف،ابہام کی پالیسی۔اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے تاریخ میں ہے۔ہمارا یہ خطہ خیبر پختونخوا میں ایسی تحریکیں اٹھیں جنہوں نے کہا کہ اگر الگ سے ملک بننا ہے تو پھر ہم کو پختونستان بنانا چاہیے۔یہ ایک الگ ملک کے طور پر ہے اور افغانستان نے اس کی حمایت کی اور اب بھی کابل میں ایک چوک کا نام پختونستان ہے۔یہ اس وقت کا منظر تھا جس سے ہمارا سیاسی بیانیہ بنا،یعنی بھارت کے ساتھ مخالفت اور افغانستان کے ساتھ ایک شک اور ابہام کی پالیسی۔عدم اعتماد کا ماحول۔اسی کیفیت میں ہمارے نصاب اور ذرائع ابلاغ کی تشکیل ہوئی۔ٹی وی ابھی نہیں آیا تھا مگر ریڈیو کے ذریعے پروپیگنڈا کیا گیا۔یہ کہا گیا کہ افغانستان ان ملکوں میں تھا جنہوں نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کو قبول کیا،اگر افغانستان پاکستان کو نقصان پہنچانا چاہتا تو 1965ء کی جنگ میں نقصان پہنچا سکتا تھا۔71ء میں جو ہمارا بحران تھا اس میں نقصان پہنچا سکتا تھا۔مگر اس وقت کے بادشاہ ظاہر شاہ نے ایسا نہیں کیا مگر یہ چیزیں ہمارے نصاب کا حصہ نہیں ہیں۔تو ظاہر ہے ایسی کیفیت میں جب ہمارا ذہن بنا،ذہنی تشکیل ہوئی اس کے نتیجے میں جو ہمارا بیانیہ بنا وہ ہمارے نصاب میں آیا،پھر ہمارے طالب علموں نے وہی پڑھا۔چونکہ ہمارے ہاں ناقدانہ سوچ نہیں ہے ہم سوال نہیں

کرتے۔کبھی ہم نے یہ سوال نہیں کیا کہ ہندو کے ساتھ لڑائی ہمارا دینی فریضہ ہے تو نیپال کے ہندو کے ساتھ ہماری لڑائی کیوں نہیں ہے۔دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جس کا سرکاری مذہب ہندوازم ہو۔صرف نیپال کا ہے۔کیوں نیپال ہمارے اچھے دوستوں میں ہے۔ضرورت اس بات کی تھی کہ جھگڑا انڈیا کے ساتھ ہے تو نام ہندو کا نہیں انڈیا کا ہونا چاہیے تھا۔اس کے نتیجے میں ابتدائی ادوار میں ہمارے مذہبی تانے بانے جو تھے،وہ یہی تھے۔یہ شیعہ سنی کی باتیں پورے ملک میں نہیں ہوتیں تھیں۔محرم کی محافل ہوتی تھیں اور مجلسیں ہوتی تھیں کبھی ہم میں اور ان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔عیسائی اور مسلمان،ہندو اور مسلمان کی کبھی تفریق نظر نہیں آئی۔سندھ میں ہندوؤں کی بڑی تعداد ہے،اسی طرح بلوچستان میں بھی ہیں اور کے پی کے میں بونیر کا جو علاقہ ہے،وہ سارا سکھوں کا ہے۔شیعہ سنی کی تفریق کبھی نہ تھی۔جنرل ضیاء الحق کے دور میں یہ ساری تفریق ہم نے دیکھی،ہمارا سارا سیاسی وسماجی منظر نامہ اُس وقت تبدیل ہوا۔اس کی وجہ کیا تھی؟ ظاہر ہے کہ ضیاء الحق کا کوئی حلقہ نہ تھا نہ اسے حلقے کی ضرورت تھی۔اور جو مسلمہ حلقے تھے اُن کو توڑنے کی ضرورت تھی چنانچہ یہ حلقے ایک منظّم کوشش کے ذریعے توڑ دیے گئے۔کراچی میں لسانی عصبیت کے ذریعے تفریق پیدا کی گئی اور یہاں مذہب کے ذریعے تفریق پیدا کی گئی۔ایران جو شیعہ مسلک کا ملک ہے وہاں امام خمینی کے ذریعے انقلاب آیا تو یہاں فیصلہ ہوا کہ اس کو خطے میں پھیلنے سے روکا جائے اس کے لیے دینی جماعتوں کو منظّم طریقے سے توڑا گیا۔اُن تنظیموں کے ٹکڑے کیے گئے جو چھوٹی چھوٹی تنظیمیں پیدا ہوئیں انہوں نے باقاعدہ تشدد کے راستے اختیار کیے۔کراچی میں تشدد کے راستے اختیار کیے گئے جو ہمارا معیشت کا ہب ہے۔اس وقت کراچی کے بارے کہا جاتا تھا کہ وہاں کوئی بھوکا نہیں سوتا اور اگر کوئی بے روزگار یا بے یارومددگار ہے تو وہ کراچی میں جائے وہاں اس کو سر کا سایہ ملے گا۔مگر تشدد سے پورا سیاسی،سماجی،مذہبی منظر تبدیل ہوتا گیا۔مذہب کے نام پر ہمارے سادہ لوح معاشرے کو اُکسایا گیا۔اگر یہاں کے لوگ کوئی عربی کی عبارت دیکھیں تو وہ اس کو حدیث سمجھتے ہیں۔چنانچہ عربی اخبار بھی کسی نے ڈسٹ بن میں پھینکا ہے تو اس پر بھی توہین رسالت لگ جاتی ہے۔یعنی مذہب کے نام پر ورغلانہ آسان ہے۔چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے اور اس کے بعد دینی اداروں کو ریاست کے اہداف کے لیے اور ریاستی بیانیے کے لیے استعمال کیا

گیا۔اس کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر ہمیں یہ کہا جانے لگا کہ وہ کوششیں جو نظم آبادی کی تھیں تا کہ آبادی کو ایک حد کے اندر رکھا جائے اس کے خلاف بھی یہ کہا گیا کہ دین اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ تنظیم آبادی کریں بلکہ دین کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ آبادی کو بڑھائیں۔انسان حیران رہ جاتا ہے کہ جو دوسرے کام ہیں اس میں تو دین آڑے نہیں آتا۔ہم دغا بازی کرتے، جھوٹ بولتے، دوائیوں میں ملاوٹ کرتے ہیں،اُن کے لیے دین کا نام کبھی سامنے نہیں آیا مگر آبادی کی تنظیم کی جائے تو دین بیچ میں آجاتا ہے۔بھٹو کے بعد جو بڑی تبدیلی آئی کہ لوگ بڑی تعداد میں مدرسوں کی طرف جانے لگے اور مصنوعی پیسہ آنے لگا۔

جنرل ضیاء کا کوئی حلقہ نہ تھا اس کو سویلین میں حلقے کی ضرورت تھی اور پھر اس نے کھلا سیاست پیدا کی۔اور غیر سیاسی جماعتوں کے بغیر الیکشن کی طرح ڈالی گئی۔مذہبی مسلکی اور اس کے نتیجے میں ہمارا ذہن غیر تنقیدی بنا۔سوچنا سمجھنا سکھایا نہ گیا، تمام ناکامیوں کی ذمہ داری اوروں کے سر ڈالنا آسان ترین کام ہے ہم ایسا ہی کرتے ہیں یہی ہمارا قومی بیانیہ بن گیا۔مسلمانوں کے اندر تنوع کا مکمل خاتمہ ہوا۔اس کی وجہ سے جو نتائج سامنے آئے ان کو تسلیم کرنے کی بجائے یہ کہنا کہ ہمارے مسائل کا فلاں ذمہ دار ہے یہ آسان اور دل خوش کن طریقہ ہے۔اس خواب میں ہمیں رکھا گیا۔اس منظر نامے میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے کیا خدمات اور کردار ادا کر سکتے ہیں؟ یہی ہمارا موضوع ہے اور یہی ہماری کوشش ہے کہ کوئی فوکس اور مربوط تصور سامنے آئے۔چنانچہ جو بڑے تعلیمی ادارے ہیں ان میں جو علوم اسلامیہ یا سماجی علوم کے اساتذہ اکرام ہیں یا جو ادب کے ساتھ منسلک ہیں، ان کا کردار نمایاں ہوگا۔سب سے پہلی چیز وہ یہ ہے کہ جو اساتذہ اکرام اسلامی علوم کے ساتھ منسلک ہیں، ان کا کردار کالجوں اور جامعات میں متاثر کن ہے۔کیا وہ جامعات کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں؟ اور معاشرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں؟ یہ ہماری کمزوری ہے اور اسی کمزوری کو ہم نے دور کرنے کی کوشش کرنی ہے۔اس کو ختم کرنے اور کم کرنے کی کوشش کرنی ہے۔کیسے اس کمزوری پر قابو پانا ہے۔سب سے پہلے ہمیں اپنے مضامین میں مہارت حاصل کرنی ہے۔آج اس گئے گزرے دور میں بھی جب علم کو پیسے کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور تعلیمی ادارے کاروبار بن گئے اس میں بھی وہ استاد جو اپنے مضمون کا ماہر ہو، اس کی قدر اور عزت کی جاتی

ہے۔شاگرد ان کا اثر لیتے ہیں۔آج صبح ڈاکٹر خدیجہ عزیز نے اپنا ایک تجربہ شیئر کیا۔جب وہ اسلاموفوبیا کا موضوع سوشیالوجی کے طالبِ علموں کے پاس لے کر گئی تو اُنہوں نے کہا کہ اسلامیات کا موضوع نہیں ہے، آئی آر کے طلبا نے بھی یہی کہا۔جب اسلاموفوبیا، اسلامیات کا موضوع نہیں تو وہ لوگ ہمیں کیا بتانا چاہتے ہیں، وہ یہ بتانا چاہتے ہیں تم اگلے وقتوں کے لوگ ہو، اسلاموفوبیا آج کا موضوع ہے۔یہ موضوع آپ کا کام نہیں۔آپ کا تعلق آج کے دور کے ساتھ نہیں۔چنانچہ جس چیز نے اس کو آج ہماری ضرورت بنادیا تو علوم اسلامیہ کے ساتھ جو ہیں، وہ صرف علوم اسلامیہ تک محدود نہ رہیں بلکہ دیگر موضاعات کی طرف آئیں۔اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ہمارا مؤثر کردار ہو، لوگ ہمیں اہمیت دیں تو اس کے لیے ہمیں بہت محنت کرنی ہوگی۔اور ہمیں ذہنی اُفق کو وسعت دینی ہوگی۔تب جا کر اس علوم کے اساتذہ کو سنا جائے گا، ان کو وقعت اور اہمیت دی جائے گی۔مغرب میں کیوں مذہب اور علومِ اسلامیہ کے ڈیپارٹمنٹ کی قدر کی جاتی ہے؟ اس لیے قدر کی جاتی ہے کہ وہاں جن موضوعات پر کام ہو رہا تھا، اُن موضوعات کے لوگ سفارت خانوں میں جاتے ہیں، ان کا تعلق فارن پالیسیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ملک کے ساتھ بہتر مارکیٹ میں بہتر تاثر پیدا کرنا ہوتا ہے، جب انہوں نے اپنی جامعات کو بہتر سفارت کاری کے ساتھ منسلک کر دیا تو ظاہر ہے کہ اس مضمون کی عزت بڑھ گئی۔ہم نے اپنے اس مضمون کو ماضی کے ساتھ منسلک کیا مگر آج کے عہد کے ساتھ منسلک نہیں کیا اور نہ اس کی کوشش کی۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارا وزن یونی ورسٹیوں میں کمزور ہے۔دوسری بات یہ ہے اعلیٰ تعلیم میں یونی ورسٹیوں میں جو پالیسیاں بنتی ہیں، ان سے ہم آگاہ ہیں، ہماری اکثریت یونی ورسٹیوں کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے سے قاصر ہے اور جب پالیسیوں پر اثر انداز ہونے سے قاصر ہوں گے تو پھر ظاہر ہے کہ جو مختلف اسٹیک ہولڈر ہیں وہ آپ کو وقعت نہیں دیں گے۔ضرورت اس بات کی ہے ہم اس طرف آجائیں اگر ہم اس طرف آگئے تو ہمارا وزن بڑھے گا اور سماجی و سیاسی کردار کی وجہ سے ہماری عزت ہوگی۔پھر جو جدید ذرائع ابلاغ ہے ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ کوئی ان کو روک نہیں سکتا۔آج کی جنریشن آگے جائے گی اس کو آگے جانا چاہیے اس کو روکنا نہیں چاہیے نہ ہم اس کو روک سکتے ہیں۔اسی جنریشن کے تقاضوں کو سمجھ کر ہمیں آگے

بڑھنا ہے۔علوم اسلامیہ کے لوگوں کو ٹویٹ کی طرف آنا ہے، ان کو بلاگنگ کی طرف آنا ہے تاکہ وہ اپنے متاثر کن خیالات بلاگ کے ذریعے پیش کریں۔آج کی جنریشن کو ہم ٹویٹ اور بلاگنگ کی وجہ سے متاثر کر سکتے ہیں۔نئے ذرائع ابلاغ کی وجہ سے آپ کو عزت دی جائے گی اور آپ کا اثر بھی آگے کی طرف بڑھے گا۔آپ دیکھتے ہیں کہ کچھ مذہبی لوگ ہیں جو معاشرے کے نقصان کا باعث بنتے ہیں مگر وہ جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال کر رہے ہیں اور اُنہی کا اثر بڑھ رہا ہے۔لہٰذا اگر درست لوگ اس طرف نہیں آئیں گے تو ذرائع ابلاغ کا درست استعمال سامنے نہیں آئے گا اور مسائل بڑھیں گے۔پھر طالبِ علموں کے ساتھ ذاتی رابطے ضروری ہو گئے ہیں۔ان کے اندر جو خفیہ صلاحتیں ہیں ان کو فروغ دیں۔مذہبی حوالے سے ہم نے پشاور میں غیر مسلم کا کوٹا منتخب کیا۔یہ ہمارے وسیع ماحول کا حصہ بنیں گے۔یہ مختلف شعبوں میں جائیں گے تو تنوع پیدا ہوگا، حسن پیدا ہوگا۔افغانستان میں خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ ہم افغان طالبِ علموں کو سپانسرڈ کریں گے۔تین سال کے بعد حکومت نے پالیسی بنائی لیکن پشاور یونی ورسٹی نے تین سال پہلے اوپن ڈور افغان سٹوڈنٹس پالیسی بنائی اگر اس طرح اقدامات اساتذہ شروع کریں تو ہم بہتری کی طرف جائیں گے ان کی آواز کو وزن ملے گا۔اگر ایک بار لوگ وزن دینا شروع کریں تو یہ بہت اچھا ہوگا۔اساتذہ کو جمعے کے خطبے اور ٹی وی پروگراموں کی طرف آنا چاہیے اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہم بہتری کی طرف جائیں گے۔ہم اسی طرح معاشرے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔اعلیٰ تعلیمی اداروں میں یہی ہمارا کردار ہونا چاہیے۔یہی کلمات تھے جو میں آپ لوگوں سے شیئر کرنا چاہتا تھا۔

سوالات کے جوابات

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

اگر آپ اپنے آپ کو اس ماحول میں واپس لے جائیں تو میرے خیال میں مجھے درست تاریخ تو یاد نہیں شاید 1882-83 کا واقعہ ہے کہ برطانیہ کی وزیرِ اعظم مارگریٹ تھیچر نے طورخم بارڈر پر کھڑے ہو کر افغانستان کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ اس قوم کے اندر خدا سے زیادہ محبت

ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت جو سب سے بڑی دلیل تھی وہ یہ کہ امریکہ سے جو بھی مدد آئی وہ مذہبی تنظیموں کی طرف آئی۔اُنہوں نے کہا کہ امریکہ چونکہ عیسائی ملک ہے وہ خدا کو مانتا ہے اور روس خدا کو نہیں مانتا لہٰذا یہ ٹھیک ہے۔

ایران میں بھی تبدیلی آئی ایران کے جو حالات ہیں، وہ سارے بلیک ہیں یا وائٹ ہیں ظاہر ہے یہ پیدا کیے گئے ہیں۔جو فیصلہ کن ایک موڑ آیا وہ جنرل ضیاء الحق کا دور تھا۔میں نے دینی جماعتوں کو بیان نہیں کیا۔میں نے بنیادی بات یہ کی جس طریقے سے سیاسی وسماجی منظر نامہ تشکیل دیا گیا، افغان جہاد کا ریفرنس میں دیا، اسی طرح کراچی کا حوالہ دیا جس میں لسانی عصبیت کو آگے بڑھایا گیا۔میں نے ایران کا حوالہ دیا کہ جس زمانے میں افغانستان میں تبدیلی آئی اسی زمانے میں ایران میں بھی تبدیلی آئی۔تو ایران کے ساتھ ہماری پالیسی تبدیل ہوگئی اور عدم اعتماد پیدا ہوا اس حوالے سے میں نے گزارش کی تھی۔بہر حال اہم موڑ جنرل ضیاء کا تھا۔

خورشید ندیم

بہت شکریہ قبلہ ایاز صاحب۔کل کی جو نشست ہے وہ اسی حوالے سے ہے۔اس میں قبلہ ایاز کا خطبہ بھی ہوگا۔بہت سارے سوالات بھی ہوں گے۔آج کی گفتگو کو بھی آپ لوگ ذہن میں رکھیں کل بھی آپ سوال کر سکتے ہیں۔ڈاکٹر خالد مسعود کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے وہ ہے پاکستان میں مذہبی ومسلکی تنوع اور مذہبی اداروں کا کردار۔

عنوان: **پاکستان میں مذہبی ومسلکی تنوع اور مذہبی اداروں کا کردار**

مقرر: **ڈاکٹر خالد مسعود**

اختلاف کے بارے میں اکثر ہم یہ کہتے ہیں کہ اختلاف کو ختم کیا جائے اور ہم سب کو اتفاق اور اتحاد کی طرف آنا چاہیے۔یہ بات اس حد تک درست ہے کہ اتحاد کے بغیر ہم آہنگی نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔لیکن اس کی وجہ سے اختلاف کے بارے جو منفی تاثر ابھرتا ہے۔میں توجہ چاہوں

گا۔اختلاف کواللہ نے اپنی آیات سے بیان کیا ہے۔اسلامی روایات میں اختلاف ایک اہم قدر ہے۔ایک مثال دوں گا۔فتاویٰ عالمگیری،اس لیے مرتب کی گئی تھی کہ قاضیوں کے فیصلوں میں اختلاف بہت تھا اس لیے اورنگزیب عالمگیر نے یہ سوچا کہ اس اختلاف کو ختم کرنے کی ضرورت ہے،اس کے لیے ایسی کتاب کو تدوین کیا۔اس کتاب کے ہر باب میں بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ اس مسئلے کے لیے فقہ حنفی میں تین قول ہیں،دو قول ہیں۔اور وہ اختلاف ان معنوں میں ختم نہ ہوسکا جو اورنگزیب کا مقصود تھا۔اگر آپ فقہ کی تمام کتابوں کو دیکھیں تو اختلاف سے بات شروع ہوتی ہے اور پورے التزام کے ساتھ اس کا بیان کیا جاتا ہے۔تنوع،تبدیلی،تغیر،اختلاف، یہ جتنے الفاظ ہیں،اس کو اسلامی روایات میں ایک موقع سمجھا گیا ہے۔اس کو منفی استعمال نہیں کیا گیا تو ہم منفی کیوں خیال کرتے ہیں،پھر ہمارے ذہنوں میں ان الفاظ کے متعلق یا اختلاف کے متعلق منفی سوچ کیوں ہے۔میرے خیال میں دو باتیں ہیں۔ایک تو ہماری سوچ پر یونانی فکر کا بہت غلبہ ہوا۔ہم نے یونانی فکر کے علم الکلام کو اسلامیانے کی کوشش کی۔ان کی کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم نے اسلامی روایات سے زیادہ پذیرائی دی،ان میں ایک چیز یہ ہے کہ اچھی چیز وہ ہے جو پرفیکٹ ہو،اس میں کوئی تغیر نہ آئے۔ چنانچہ یونانی علم میں فزکس کو اچھا سبجیکٹ نہیں سمجھا جاتا۔یونانی سائنس کے مطابق فزکس ایسی چیزوں کا مطالعہ کرتی ہے جو ختم ہو جاتی ہیں اور مابعدالطبعیات اس لیے ایجاد ہوئی کہ مابعدالطبیعات میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔مابعدالطبعیات انسان کی پیدا کردہ ہے اور طبعیات اللہ کی پیدا کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ کو اپنی تخلیق پر فخر ہے کہ اس میں اختلاف ہے۔اختلاف کے ضمن میں جو چیزیں ہیں،ان میں ایک تو اختلاف تبدیلی کے معنوں،ایک تنوع کے معنی میں،اور ایک اختلاف وہ ہے،جیسے لیل و نہار۔اس کی تبدیلی پر زور ہے،اس کے تنوع پر نہیں جہاں اس کے رنگ کا زور ہے تو وہاں تبدیلی کی بات ہے۔یونانی فکر کا ایک پہلو جو ہماری فکر میں آ گیا کہ ہر شئے پرفیکٹ ہے۔قرآن میں ہے کہ دین مکمل ہو گیا اور اس کا معنی بھی ہم نے وہی لیا جو یونانی فلاسفی میں تھا،کہ یہ مکمل ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔نہ اس میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے اور اس میں ہر چیز کا علاج موجود ہے۔چنانچہ ہم اکثر یہ کہتے ہیں کہ یہ مکمل ضابطہ حیات ہے۔ہر چیز کا جواب اس میں موجود ہے۔آپ اسلامی روایات کی کوئی بھی کتاب پڑھیں اس میں

لکھا ہوا ہوتا ہے کہ واقعات اور حالات میں اتنی تبدیلی اور تنوع آتا رہے گا کہ کسی مسئلے کا حل ایک جیسا نہیں ہوگا۔آپ ﷺ معاذ بن جبل کو کہیں بھیج رہے تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ فیصلے کیسے کرو گے تو انہوں نے کہا کہ قرآن سے دیکھوں گا۔تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ اگر جواب قرآن میں بھی نہ ہوا تو پھر۔اس بات کو ذرا ذہن میں رکھیں کہ حضور ﷺ پہلے ہی یہ ذہنوں میں ڈالنا چاہتے تھے کہ یہ ان معنوں میں مکمل نہیں ہے کہ ہر بات کا جواب ملے۔دوسری بات یہ ہے کہ اگر سنت میں نہ ملے تو۔تو انہوں نے کہا کہ میں اجتہاد اور غور و فکر سے جواب ڈھونڈوں گا۔تو آپ ﷺ نے اُن کو شاباش دی۔میں اشارہ اس طرف کر رہا ہوں کہ ابھی جب قرآن مکمل نہیں اترا تھا اور سنت اور آپ ﷺ کی زندگی ابھی جاری تھی،اور اس وقت اس تصور کو لیا گیا۔جب مکمل کی بات ہوتی ہے تو ہماری اسلامی روایات میں یہ نہیں کہ ہر بات اور ہر سوال کا جواب قرآن مجید اور اسلامی روایات میں ہو بلکہ یہ ہے کہ اس کے اصول بیان کر دیے گیے ہیں۔قرآن میں ہے کہ دین مکمل کر دیا گیا ہے،دین کا مطلب یہ ہے کہ اس کے جو اصول ہیں وہ بتا دیے گئے ہیں۔وہ بیان کر دیے گئے ہیں۔تو یہ جو تصورات ہیں،اس پر غور کریں تو یہ ہم نے قرآن سے اخذ نہیں کیے۔اگر آپ ابن خلدون کو ہی پڑھ لیں تو طبیعات سے زیادہ مابعدالطبیعات کو سب سے بڑا علم بتاتے ہیں۔

ہمیں قرآن میں اور سنت نبویؐ میں اور اسلامی روایات میں دیکھنا پڑے گا کہ تنوع کی حیثیت کیا ہے۔قرآن میں تبدیلی کے انداز کا ذکر ہے۔ایک تو ہے کہ اللہ کی سنت جو ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں۔اگر آپ اس کو ان معنوں میں لیں جن معنوں میں آج ہم ان پر بحث کرتے ہیں تو قوانین فطرت جو اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں۔بہت عرصے تک ہماری سائنس میں پڑھایا گیا کہ لاء آف نیچر کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔لیکن بعد میں اسی میں دوسرے سائنسی نظریات بھی آئے جس سے پہلے نظریات میں تبدیلی آئی۔ہمارے ہاں ہر چیز کو رد کیا گیا۔جن چیزوں کو ہم یہ سمجھ کر رد کر رہے ہوتے ہیں کہ ان قوانین فطرت میں ردو بدل نہیں،دراصل وہ بھی فطرت کے قوانین ہوتے ہیں جن کا ہمیں پتا اس وقت نہیں چل رہا ہوتا۔اس وقت سائنس کی جو ایجادات ہیں وہ ٹیکنالوجی کی ہیں،مثلاً یہ جو وائی فائی ہے،یہ جو لہریں ہیں یہ تو پہلے بھی موجود تھیں،ہم نے اس کو دریافت اب کیا ہے۔سنت اللہ تو موجود ہے لیکن ہمارا علم اس

تک نہیں گیا۔قرآن مجید میں ایام اللہ، تاریخ ہے مختلف اقوام کی،اس میں ان کی زندگیوں کی جوتبدیلیاں ہیں وہ بتائی گئیں مثلاً بتایا کہ کیسے سماجی،علمی طور پر تبدیلیاں آئیں۔اللہ تعالیٰ کا جو اصول ہے جس سے سماج میں تبدیلی آتی ہے وہ سماج خود کو پہلے تبدیل کرنا چاہتا ہے۔سماج اپنی تبدیلی پہلے شروع کرتا ہے پھر اللہ ان کو تبدیل کرتے ہیں۔اگر ہم تبدیلی کے اصول سامنے رکھیں تو یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تبدیلی یا اختلاف کوئی منفی پہلو نہیں بلکہ مثبت پہلو ہیں۔

عام طور پر ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ امی تھے۔اس پر بھی ذرا غور کیجیے گا۔یہ ہمارے عقلی دلائل کا حصہ ہے۔صرف رسول اللہ کو قرآن میں امی نہیں کہا گیا بلکہ پورے عرب کو کہا گیا،اور امی اس معنی میں نہیں کہا گیا کہ وہ ان پڑھ تھے بلکہ ان معنوں میں کہ ان پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی تھی۔امی کا جو تصور ہے یہ کتاب اور وحی کے نزول کے حوالے سے تھا۔رسول اللہ ﷺ کی صفت جو قرآن میں آئی ہے وہ یہ کہ وہ ان کو کتاب پڑھاتا اور حکمت سکھاتا ہے۔میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ جو کتاب کا مفہوم ہے وہ لکھنے پڑھنے میں آتا ہے۔کتاب کا تصور جو کہ عرب کی عام طور پر ثقافت تھی وہ یہ کہ ہزاروں کی تعداد میں اشعار حافظے کا حصہ ہوتے تھے،وہاں کتاب کی ثقافت کو شروع کیا گیا۔ہماری اسلامی روایات میں اس کی وجہ سے کافی دقت پیش آرہی ہے وہ یہ کہ اسلام کی مستند علم کا جو ذریعہ ہے وہ وحی ہے،یہ معتزلہ کی بحث ہے،جس میں ہے کہ وحی ہی ذریعہ ہے علم کا اور انسان کو اپنی عقل سے،تجربے سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ مشکوک ہے۔اس کی حیثیت وہ نہیں ہے۔قرآن میں کہا گیا کہ ہر انسان کو اچھے برے کی تمیز کا علم دیا گیا پھر ہر انسان کی نفسیات میں یہ رکھا گیا کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔پھر قران میں جو کائنات پر غور و فکر کرنے کائنات کا مطالعہ کرنے کی بات اس لئے کی گئی تا کہ آپ اللہ کی خلاقیات کو سمجھ سکیں گے۔گویا انسان کے اندر اللہ نے اہلیت رکھی ہے کہ وہ ان چیزوں کو دیکھ کر علم حاصل کر سکتا ہے۔ہم نے انسانی عقل کو کم تر درجہ دیا،حالانکہ اس کے بغیر ہم قرآن کو نہیں سمجھ سکتے،وحی کو نہیں سمجھ سکتے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔اس سب کی وجہ سے مابعد الطبیعات کو زیادہ توجہ دی گئی۔ہمارے ہاں اسلامی علوم کو مختلف ناموں سے جو پڑھایا جاتا ہے،عرب دنیا میں اس کو اصولِ دین کہتے ہیں،اس کا کوئی ڈسپلن نہیں ہے۔اس کی بحث وہی ہے کہ علم کہاں سے آتا ہے اور اس کی ترسیل کہاں سے کی

جاتی ہے۔اس میں ہم نے علم کے ماخذ صرف وحی پر بات کی ہے انسانی عقل و تجربے پر نہیں۔انسان کو نیکی اور بدی کا علم ایک تو اللہ نے دیا ہے لیکن زیادہ تر وہ اپنے تجربے سے سیکھتا ہے۔جو چیز عام طور پر اس کو اچھی لگے اسے اچھا اور جو بری لگے اس کو برا کہتا ہے،مگر کوئی چیز اچھی یا بری مکمل طور پر نہیں ہوتی۔انسان کے تجربے سے جو چیز اچھی یا بری طے ہو جائے شریعت اس کے مطابق آتی ہے۔

اب میں آتا ہوں کہ تنوع ہماری طاقت کیسے بن سکتا ہے۔پاکستان میں مذہبی تنوع ہے۔اسلام کی جو روایات ہیں وہ ہمارے ہاں عرب دنیا اور مشرق وسطیٰ سے آئی ہیں۔پھر ہندو مذہب کا تجربہ ہے۔اس میں جو تنوع ہے وہ ایک طاقت بن سکتی ہے۔کیونکہ اس میں صدیوں کی سوچ،صدیوں کا تجربہ موجود ہے۔جہاں تک یہاں کے مسالک کا تعلق ہے تو اس میں بھی بہت تنوع ہے۔ہمارے ہاں زیادہ تر حنفی یا شیعہ ہیں،اب دوسرے بھی ہیں جیسے اہلحدیث۔حنفی اور جعفریہ میں جو فرق ہے وہ تعبیر کا فرق ہے۔

باتیں تو بہت سی ہیں میرا خیال ہے میں یہاں اس کو ختم کروں گا۔دو باتیں دہراؤں گا ایک تو یہ کہ تنوع ہماری طاقت ہے۔اس سے نئی سوچ پیدا ہوگی،اس سے ہمیں مسائل کو سمجھنے میں بھی فائدہ ہوگا۔اور دوسرا یہ کہ ہماری روایت جو ہے وہ پُر ثروت ہے۔ ہر صدی میں اس میں اتنی کوششیں ہوتی رہیں کہ وہ تجدید،احیاء اور تدوین کے ذریعے پچھلے اختلاف کو شامل کر لیتے ہیں۔ان کی رہنمائی میں ہم اپنے علومِ اسلامیہ کا ایک ایسا ڈسپلن بنا سکتے ہیں جو آج کا علم ہے اس کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں۔

سوالات کے جوابات:

پہلی تو دقت اس لیے ہے کہ آپ نے وہی کیا جو ہمارا مسئلہ ہے۔آپ نے میرے الفاظ کو اپنے طور پر سمجھا ہے۔علمی دیانت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو دوسرا کہہ رہا ہے تو اس کے سیاق و سباق میں رہیں۔مثلاً میں نے یہ کہا کہ تغیر و تبدل کا جو تصور ہے وہ یونانی فلاسفی سے لیا گیا ہے۔آپ نے کہا کہ اصول ہم نے دوسروں سے لیے،قرآن سے نہیں لیے۔میرے اور آپ کے کہنے میں زمین

آسمان کا فرق ہے۔ ہجرت پہلے غیر مسلم علاقے سے مسلم علاقے کی طرف تھی، اب مسلم علاقے سے غیر مسلم علاقے کی طرف ہے۔ باہر پڑھنے کے لیے جاتے ہیں، روزگار کے لیے جاتے ہیں، اس پر بہت بحث ہے۔ ہجرت کرنے والا اپنے خاندان کا فائدہ کرنا چاہتا ہے مگر وہ نیت دعوت کی کر لے تو یہ درست ہجرت بن جائے گی۔ یہ سارے مسئلے رہے اور اس کو جوڑ دیا گیا کہ یہ آپ کی عارضی ہجرت ہے آپ واپس آ جائیں گے۔ لیکن وہ واپس آ گئے تو پھر نئی فقہ کی ضرورت پڑ گئی۔

دوسرا دن

پہلی نشست: عدم برداشت اور شدت پسندی

صدارت: خورشید ندیم

مقررین: ڈاکٹر قبلہ ایاز، محمد عامر رانا

عنوان: عدم برداشت، سماجی ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ

مقرر: ڈاکٹر قبلہ ایاز

انسانی تاریخ کے جو مختلف ادوار ہیں اس وقت ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ عالمگیریت کا دور بھی نہیں بلکہ مابعد عالمگیریت کا دور ہے۔ اس دور کے اپنے تقاضے اور مطالبے ہیں، وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو وقت کے تقاضوں کو سمجھیں اور جس عہد میں زندہ ہیں اسی عہد کے ساتھ چلیں۔ اس مابعد عالمگیریت دور میں، ظاہر ہے وہی قوم بین الاقوامی دنیا میں قابلِ عزت سمجھی جاتی ہے جن کے اندر برداشت ہو۔ بلکہ وہ دوسروں کو قبول کرتی ہوں۔ برداشت سے زیادہ بہتر لفظ قبولیت ہے۔ جس معاشرے میں قبولیت کا ماحول ہو اور ایک دوسرے کے احترام کا ماحول ہو تو معاشرہ میں اس کی وجہ سے بہتر تعاون پیدا ہو جاتا ہے اور جب بہتر تعاون پیدا ہو جائے تو معاشرہ آگے کی طرف بڑھتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔ ہمارے ہاں عمومی طور پر صورتِ حال یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو قبول نہیں کرتے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر بھی ہے اور مسلک اور قومیت کی سطح پر

بھی۔ مجھے واٹس ایپ پر ایک چیز ملی، آپ سے شیئر کرتا ہوں۔ ”میں مسلمان تھا تو مجھے ہندو سے ڈر تھا اور ہندو کو مجھ سے۔ اب اگر میں شیعہ ہوں تو مجھے سنی سے ڈر ہے اور سنی کو شیعہ سے ڈر ہے۔ اگر پشتون ہوں تو مہاجر سے ڈر ہے اور مہاجر کو پشتون سے ڈر ہے۔ پولیس کا جوان ہوں تو طالبان سے ڈر ہے، سیاستدان ہوں تو آرمی چیف سے ڈر ہے، دکان دار ہوں تو بھتہ خور سے ڈر ہے، نمازی ہوں تو خودکش سے ڈر ہے، جینز پہنتا ہوں تو مذہبی لوگوں سے ڈر ہے“۔ اس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ عدم قبولیت بڑھ رہی ہے۔ عدم برداشت اور عدم قبولیت ہمارے محلوں، گھروں اور جامعات میں ہے۔ اب ہم کس طریقے سے اپنے دینی ورثے سے استفادہ کریں، ظاہر ہے قرآن پاک کی طرف جانا چاہیے۔ سیرت رسول ﷺ کی طرف جانا ہے۔ تب کہیں جا کر ہمیں ورثے سے بہت کچھ مل سکتا ہے۔ جب ہم قرآن کے ساتھ چلتے ہیں تو دو کردار ملتے ہیں ایک ہابیل اور دوسرا قابیل۔ قابیل کا کردار جارح شخصیت کا حامل تھا اور ہابیل کا کردار قبولیت کا حامل کردار ہے۔ ہابیل کا کردار ایسا تھا جو معاشرتی اعتبار کا سلوک اپنے بھائی کے ساتھ کرتا تھا، جو قبولیت چاہتا تھا۔ دونوں کے مقابلے میں ہمیں اچھے اسباب ملتے ہیں۔ ہابیل مثالی شخصیت بن کر اور اللہ کا مقبول بندہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اللہ کا مقبول بندہ وہ بنتا ہے جو معاشرتی اعتبار اور قبولیت کا حامل ہوتا ہے۔ ان کے بعد ہمارے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام معاشرتی اعتبار کے حامل پیغمبر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں ہمارے سامنے حضرت موسیٰ سامنے آتے ہیں۔ بنی اسرائیل پر فرعون کی وجہ سے بہت کڑا وقت آیا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عدم برداشت کی پہلی مثال قائم کی۔ آپ نے عدم تشدد کے ذریعے پوری قوم کو نجات دلائی۔ اسی طرح کی دیگر باتوں کو ہمارے ہاں نہیں پڑھایا جاتا۔ اب اگر ہم حضور اکرم ﷺ کی بات کریں تو آپ ﷺ کے بارے میں بھی ہمیں عمومی علم ہے۔ ظاہر ہے اس میں جو ہمارا ذہن بنا ہے وہ دو حوالوں سے بنا ہے۔ ایک غلبے کے حوالے سے، اگر مسلمان غالب نہیں رہے تو مزاحم رہے ہیں۔ یوں ہمارا ذہن غلبے یا مزاحمت سے بنا ہے۔ چنانچہ غلبے اور مزاحمت کی وجہ سے ہماری جو ذہنی کیفیت بنی، اس میں ہم جب نبی ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو غلبے اور مزاحمت کی روشنی کے تحت کرتے ہیں۔ جب کہ آپ ﷺ کی دیگر تعلیمات کو ہم بالکل اجاگر نہیں کرتے، نہ نصاب میں، اور نہ نصاب کی باہر کی

کوششوں میں یہ تعلیمات ہمارا حصہ نہیں رہیں۔ اگر ہم رسول اللہ ﷺ کی مجموعی شخصیت دیکھیں تو ایک بے انتہا رحم دل انسان کی شخصیت سامنے آتی ہے۔ بے انتہا قبولیت والے انسان کی۔ بے انتہا انسانی احترام والی شخصیت۔ ایک بے انتہا سخی انسان کی شخصیت۔ آپؐ کا اسوہ حسنہ، ہمسائیوں کے ساتھ تعلقات، ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کی مثال قائم کی جو آپ ﷺ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان چیزوں سے ہم نے سیکھنا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے اسلاف ہیں۔ جن کی شاندار روایات ہمارے سامنے آئی ہیں۔ حضرت عبیداللہ سندھیؒ کی ایک شاندار روایت پیش کرتا ہوں۔ آپؒ نے کہا کہ اگر بہار میں ہیں تو رفع یدین آپ کے لیے سنت ہے اور اگر آپ پشتونوں کے علاقے میں ہیں تو ترکِ رفع یدین آپ کے لیے سنت ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ مجموعی رویّے کا احترام کریں۔ ایک اچھا واقعہ ہمارے بزرگوں کا، آپ سے شیئر کرتا ہوں۔ واقعہ یوں ہے کہ اہلحدیث عالم دین حضرت سید داؤد غزنوی، دیوبندی عالم حضرت مولانا احمد علی آپس میں دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ ایک روز شیرانوالہ آنے کا پیغام بھیجا۔ مولانا احمد علی لاہوری نے اپنے عقیدت مندوں سے تلقین کی کہ اگر سید غزنوی صاحب ہمارے ساتھ نماز میں شریک ہوں تو سب رفع یدین کرنا، یہی مہمان نوازی کا وطیرہ ہے۔ ادھر داؤد غزنوی صاحب اپنے ساتھ آنے والوں کو فرما رہے تھے کہ دیکھو! جب وہاں نماز پڑھیں تو تم رفع یدین نہ کرنا۔ چشم فلک نے یہ عجیب نظارہ دیکھا کہ داؤد غزنوی کے ساتھی رفع یدین نہیں کر رہے تھے اور مولانا احمد علی لاہوری کے پیروکار رفع یدین کر رہے تھے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہم کو سیکھنی چاہئیں اور اپنے دوستوں تک یہ تعلیمات پہنچانی چاہئیں۔

خورشید ندیم

بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ اب میرے پاس چند منٹ ہیں۔ اس دوران کچھ سوال و جواب ہو جائیں۔

سوال: کسی دانشور کا قول ہے کہ ’’نا قابلِ برداشت کو بھی برداشت کرنا‘‘ احسان دانش کے حوالے سے ایک واقعہ ہے کہ جب کوئی اس کے پاؤں چھوتا تھا تو دوسری بار جب نہیں چھوتا تھا تو وہ

اپنے پاؤں آگے کر دیتا تھا۔ کہنا یہ چاہتی ہوں کہ جب ہم کسی کو برداشت کر رہے ہوتے ہیں، تو وہ اس کو اپنا حق سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ حق جتلاتا رہتا ہے تو ایسے رویّے کے حامل کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟

سوال: غلام مصطفیٰ

آپ نے یہ فرمایا کہ عدم برداشت سماجی ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ لیکن کچھ رویّے بہت عجیب ہوتے ہیں، مثلاً ایک شخص بہت باتونی ہے، اس کو کیسے برداشت کیا جائے، اس کو تو برداشت نہ کرنا ہی اچھا ہے۔؟

واحد گل (گورنمنٹ کالج مہمند ایجنسی) میرا سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں عدم برداشت کی جڑیں کہاں پر ہیں؟

جوابات:

ڈاکٹر قبلہ ایاز: میڈم کی طرف سے سوال آیا کہ بعض لوگ حد سے زیادہ ہی گزر جاتے ہیں۔ جب ایک بار ہماری شخصیت کے اندر یہ ایک قرینہ آ جائے کہ بجائے اس کے ہم ردعمل کی نفسیات کا شکار ہوں تو ہم اس پر قابو پالیں گے تو اس قسم کے انفرادی واقعات کو سنبھالا جا سکتا ہے۔

غلام مصطفیٰ نے کہا کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا طریقہ ایسا ہوتا ہے کہ ان کو نہ برداشت کیا جائے۔ اس سلسلے میں، میں سمجھتا ہوں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ہمارے لیے زبردست مثال ہے۔ جس میں کہا گیا کہ جہلاء کو دور سے سلام کر کے گزر جاؤ۔ واحد گل کی طرف سے پوچھا گیا عوامل کے حوالے سے۔ ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس کے عوامل ہماری طرف سے ہوں۔ دنیا میں جو واقعات ہو رہے ہوتے ہیں تو اس کے بے انتہا اسٹیک ہولڈر ہوتے ہیں۔ اور متعدد عوامل ہوتے ہیں اور ان عوامل کو ہم کنٹرول نہیں کر سکتے۔ بہت سارے عوامل ایسے ہوتے ہوں جو قوموں کو معاشروں کو مشکلات کی طرف لے کر جاتے ہوں گے۔ بڑی سطح پر ہم دیکھیں تو ہم یہ سیکھ سکتے ہیں، مثال کے طور پر ایران بھی بڑے بحران سے گزرا۔ ایران نے کیا مسائل دیکھے، کیا فوائد سمیٹے، یہ فہمیدہ لوگوں کے سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ اگر اس کا عمیق مطالعہ کیا

جائے تو پتا چلے گا کہ ایران نے اس کو کیسے ہینڈل کیا۔ظاہر ہے دنیا ہمارے کنٹرول میں نہیں ہے۔لوگوں کے اپنے مفادات ہوتے ہیں،ان مفادات کو سامنے رکھ کر وہ اپنی پالیسیاں ترتیب دیتے ہیں۔اپنی حکمت بناتے ہیں۔لیکن ہماری حکمتِ عملی ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ہم نے کیسے اپنی حکمتِ عملی بنانی ہے،اس کے اشارے میں نے رسول اکرم ﷺ کے حوالے سے دیئے ہیں۔

سوال: ساجد مقبول، ہزارہ یونی ورسٹی مانسہرہ۔آپ نے فرمایا کہ تشدد کی بنیادی وجہ ہماری نائن الیون کے بعد کی پالیسیاں ہیں۔کیا یہ سچ نہیں کہ 1980ء میں ہم امریکہ کا ساتھ نہ دیتے تو آج ہم ہدف نہ بنتے کیونکہ ان کی پلاننگ یہ تھی کہ گرم پانی کے ذخائر پر قبضہ کرلیں۔دوسرا سوال یہ ہے کہ جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ دنیا میں پاکستان کو مناسب حیثیت میسر نہیں تو اس کی بنیادی وجہ عدم برداشت کا رویہ ہے۔انڈیا کی حیثیت دنیا میں بہتر ہے تو وہاں برداشت کا عنصر زیادہ ہے۔تو کیا انڈیا میں مسلمانوں اور سکھوں کے ساتھ جو ہو رہا ہوتا ہے وہ عدم برداشت نہیں ہے؟

ڈاکٹر قبلہ ایاز: پاکستان میں عدم برداشت اور انڈیا میں برداشت، میرا خیال ہے کہ میں نے یہ نہیں کہا۔میں نے یہ کہا کہ دنیا میں اس وقت جو بعداز عالمگیریت کی جو صورتِ حال ہے،اس میں دنیا ان قوموں کی طرف جاتی ہے جو آپ کو مارکیٹ فراہم کریں۔میں نے یہ کہا تھا کہ دنیا انڈیا کی طرف اس لیے جاتی ہے کہ وہاں کی بہت بڑی مڈل کلاس ہے اور وہاں کی بہت بڑی مارکیٹ ہے۔عدم برداشت کے حوالے سے میں نے انڈیا کی بات نہیں کی تھی۔دوسرا آپ نے اس بیانیے کی بات کی،1980ء،امریکہ،روس،گرم پانی وغیرہ۔یہ ایک بیانیہ ہے،میں سمجھتا ہوں کہ اس پر بہت گفتگو ہوسکتی ہے۔اس موضوع کے ساتھ جن کی دلچسپی ہو،وہ عامر رانا صاحب کے ساتھ کسی وقت چائے کی پیالی پر بیٹھ جائیں تو وہ پوری کہانی سمجھا دیں گے۔

عنوان: مذہبی بیانیہ، تعلیم اور ریاست

مقرر: محمد عامر رانا

خواتین وحضرات، ہم نے بھی پڑھا اور آپ نے پڑھا اور پڑھ رہے ہوں گے کہ غدر کے بعد مایوسی کے سائے تھے اور ہمارے اکابرین اور رہنما اس فکر میں تھے کہ اس چیلنج کا کیسے مقابلہ کیا جائے اور اس کا ردعمل کیسا دیا جائے؟اس پر کل سے بات جاری ہے۔سرسید،علی گڑھ،جامعہ ملیہ،دیوبند،وغیرہ پر بات ہوئی۔ایک ریسپانس مولوی عبدالکریم نے دیا۔وہ رنگون کی ایک چھوٹی سی مسجد کے خطیب تھے اور سالانہ ایک آنے کی جنتری لکھتے تھے،اس سالانہ ایک آنے کی جنتری میں انہوں نے 786 کی ایک نئی تعبیر کی۔انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں کے اوپر یہ جو مصیبت کے سائے ہیں،یہ جو زوال ہے یہ زیادہ دیر تک نہیں ہے۔انہوں نے کہا کہ ایک سو سال بعد ایک تحریک شروع ہوگی۔انہوں نے بتایا کہ سات کا کیا مطلب ہے،آٹھ کا کیا مطلب ہے، چھ کا کیا مطلب ہے۔اسلام کا ایک سو سال بعد جو عروج شروع ہوگا وہ رنگون سے ہوگا۔جنتری معلوم نہیں بکی یا نہیں،لیکن ایک سو بیس سال بعد وہ جنتری راہب ویراتو کے پاس پہنچی،اس نے کہا کہ یہ جو ہم کہتے تھے کہ مسلمان اس ملک اور ہمارے ساتھ مخلص نہیں ہیں،تو یہ دیکھیں یہ اس کا بہت بڑا ثبوت ہے۔اور یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک کے اوپر قبضہ کیا جائے، یہ جو بچے بہت زیادہ پیدا کرتے ہیں اور ہماری خواتین سے یہ جو دوسری شادی کرتے ہیں،ان کو مسلمان کرتے ہیں تو یہ بنیادی طور پر اس منصوبے کا حصہ ہے جو بہت پہلے بنایا گیا تھا۔ہمیں علم ہے کہ یہ جو بیانیہ ہے۔اس بیانیہ کے اوپر برما کے مخصوص علاقے کے اندر گزشتہ کئی سال سے قتل وغارت گری جاری ہے۔اور جو اس بیانیے کی طاقت کو استعمال کرتے رہے وہ مسلمانوں کے خلاف ظلم وتشدد کرتے ہیں۔اس بیانیے کے توڑ کے لیے سعودی عرب سے لے کر امریکہ اور یورپ کی مسلمان تنظیمیں،ملائشیا اور انڈونیشیا کے علمائے اکرام نے بار کوشش کی ان کو سمجھایا جائے کہ 786 کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ چھوٹی سی بات اور بیانیہ، وہ شاید ہمیں بہت معمولی لگتا ہے۔کیا کبھی ہم نے غور کیا کہ ہمارے پاس بھی دیگر مذاہب، مسالک یا نقطہ نظر رکھنے والوں کے بارے میں بہت سارے 786 ہوں گے۔کیا ایسا تو نہیں ہے کہ جن کے بارے میں ہمارا ایک بیانیہ ہے،ایک تصور ہے،وہ ہمیں بار بار کہتا ہو کہ یہ میں نہیں ہوں۔پھر بھی آپ اس کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں۔میرا

خیال ہے کہ یہ چیلنج ایک بہت بڑا چیلنج ہے، خاص طور پر ہمارے معاشروں کے اندر جو سماجی تشکیل کے مراحل میں ہیں۔ میرے پاس اسی قسم کی چند ایک باتیں ہیں۔ چند سوالات ہیں جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ ایک سوال قبلہ ایاز نے سامنے رکھا اور دوسرا سوال یہ ہے کہ جو ابہامات اور الجھنیں ہمارے ذہنوں کے اندر ہیں، ان کا تعلق کتنا اور کس حد تک ہمارے اجتماعی رویّوں کے ساتھ ہے؟ کیا ان کا تعلق کہیں ہماری شناخت کے مسائل کے ساتھ تو نہیں ہے؟ جو حالیہ سروے ہیں، میں چند ایک آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ مثلاً گیلپ کا پاکستانی سروے ہے، وہ بتاتا ہے کہ زیادہ تر پاکستانیوں کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے 22 فیصد پاکستانی کہتے ہیں کہ ہمیں پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔ جبکہ دس فیصد انسان ہونے کے اوپر زیادہ فخر کرتے ہیں۔ بارہ سال سے گیلپ کے، تھوڑی سی اونچ نیچ کے ساتھ یہی سروے ہیں۔ کبھی 59، جو ہے 61 ہو جائے گا اور کبھی 58 ہو جائے گا۔ یہ source of inspiration کہاں سے آتا ہے کہ میں پاکستانی ہوں، میں پہلے مذہبی ہوں، میں پہلے پشتون ہوں؟ یہ تصور پہلے کہاں سے آتا ہے، میرا یہ سوال آپ کے سامنے ہے۔ کیا یہ ریاست کا کوئی ڈیزائن ہے؟ کیا یہ کوئی ریاست چاہتی ہے کہ ایسا ہو؟ اگر ریاست چاہتی ہے تو کس ذریعے سے چاہتی ہے؟ کیا یہ کتابیں جو آپ اپنے کالجز اور مدارس کے اندر پڑھاتے ہیں، اُن سے ریاست کی خواہش پوری ہوتی ہے۔ کیا یہ وہ کچھ ہے جو ان کتب کے علاوہ طالب علموں کو پڑھاتے ہیں؟ اور جن کا کتب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا؟ یہ تفریق کہاں سے آ رہی ہے۔ inspiration کہاں سے پیدا کی جاتی ہے۔ میرا یہ سوال آپ کے سامنے ہے؟

لیکن گیلپ ایک اور چیز بڑے مزے کی بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ اپنی مذہبی شناخت کو بتاتے ہیں کہ یہ ان کی پہلی شناخت ہے ان کا زیادہ تعلق کم آمدنی والے طبقات کے ساتھ ہے۔ یا نوجوانوں کے ساتھ ہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ عملی زندگی کے اندر آتے ہیں، عمر اور تجربات بڑھتے ہیں تو وہ اپنی رائے پر نظر ثانی کرتے ہیں۔ نظر ثانی کا عمل کیسے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کیا یہ نظر ثانی کی inspiration وہ اپنے تئیں کرتا ہے یا یہ اس کے پاس مسجد، مدرسے، میڈیا سے آتی ہے ؟ میرا خیال ہے کہ یہ بھی بڑا اہم سوال ہے جس کو ہمیں دیکھنا چاہیے۔ پھر ایک اور سوال جب آپ نیچرل سائنس کے طالب علموں کے ساتھ بات کریں تو بار بار یہ سوال آتا ہے کہ یہ جو

بیانیہ، دلیل، حکم ہے، ان کے اندر فرق کیا ہے؟ کیا ہمارے سوچنے کا جو انداز ہے، یا ہمارے رویّوں کی تشکیل ہے، ان کے اوپر بیانیہ اثر انداز ہوتا ہے؟ کیا ان کا تعلق ان دلیلوں کے طور پر ہے جن کو ہم نے انفرادی اور گروہی طور پر تعمیر کیا ہے؟ یا اس کا تعلق حکم کے ساتھ ہے۔ یہ حکم مذہبی یا ریاستی ہے۔ بنیادی طور پر یہ جو رویے ہیں، ان کی تشکیل کہاں سے ہوتی ہے۔؟ پاکستان کے اندر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے رویّوں کے اندر جتنی جارحیت ہے، ان کا کسی نہ کسی طور پر تعلق ہمارے مذہبی رویّوں کے ساتھ ہے۔ مذہب کے ساتھ نہیں، مذہبی رویّوں کے ساتھ۔ ان رویّوں کی تشکیل کیسے ہوتی ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ جو تازہ ترین اعداد و شمار ہیں، پاکستان کے اندر لوگ سمجھتے ہیں کہ مذہب ان کی زندگیوں کے اندر اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ مذہب کا یہ جو اخلاقی تربیت کا سوال ہے کیا ہمارے معاشرے کے اندر اخلاقی نظام کی ضروریات کو پورا کر رہا ہے یا نہیں؟ اس کو بھی ہم نے دیکھنا ہے۔ اچھا پھر دیکھئے کہ بہت سارے رجحانات ایسے ہیں جن سے بعض دفعہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے ٹکراتے بھی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر خالد مسعود رات کو بات کر رہے تھے کہ اصل ہماری قوت تنوع ہے۔ گیلپ کہتا ہے کہ پاکستان کے اندر لوگ شریعہ تو چاہتے ہیں لیکن جو آخری سروے کیا گیا، اُس کے اندر پاکستان میں جو شریعہ چاہتے ہیں، ان میں گیارہ فیصد صرف جمعے کی نماز پڑھتے ہیں۔ مذہب کے اوپر عمل کرنے اور آئیڈیلائز کرنے کے درمیان جو فرق ہے وہ کیا ہے؟ اور یہ فرق کیسے پیدا ہوتا ہے؟ یہ میرا خیال ہے کہ بہت اہم سوال ہے۔ جس کے اوپر ہم سب کو غور کرنا چاہیے۔

دوسری نشست

مذہبی عدم رواداری اور عمومی رویّوں کا بگاڑ

صدارت: ڈاکٹر عبدالحمید نیّر

مقررین: رومانہ بشیر، وسعت اللہ خان

ڈاکٹرعبدالحمید نیئر:

عدم رواداری اور عمومی رویّوں میں بگاڑ۔عمومی رویّوں میں بگاڑ سے مراد شاید وہ شعر ہے جو میں نے ایک بار سنا تھا تو مجھے بہت پسند آیا تھا۔

نہ جانے کون کس کو ماردے کافر کہہ کر
شہر کا شہر مسلمان بنا پھرتا ہے

ہمارے ہاں عدم رواداری جو کہنے کو تو ایک عالمانہ انداز سے شروع ہوئی، ہوتے ہوتے، عمومی رویّوں میں آ گئی۔اب ہم عام باتوں کو ان طریقوں سے ہینڈل کرتے ہیں۔اس سے جو تکالیف غیر مسلموں کو ہوتی ہیں، وہ بہت اندوہناک ہیں۔یہاں غیر مسلموں کے ساتھ سلوک کرنے والوں میں مذہبی رہنما بھی شامل ہوتے ہیں۔جو مسجدوں اور مدرسوں کے لاؤڈ اسپیکر کا غلط استعمال کرتے ہیں۔عمومی رویّے کیسے بنتے ہیں، ان سوالوں کے لیے جواب تلاش کرنے ہوں گے۔پھر یہ کہ ہمارے عمومی رویّوں کے اندر بگاڑ کیسے پیدا ہوا۔کون سا بیانیہ ہوتا ہے جو ان رویّوں کو جنم دیتا ہے۔یہ سوال ہیں جن کے جوابات ہم سب کو دینے ہیں۔مذہبی عدم رواداری اور پاکستان میں غیر مسلم کے ساتھ ناروا سلوک کے حوالے سے رومانہ بشیر صاحبہ کو دعوت دوں گا۔

مقرر: رومانہ بشیر

میں یہاں پہلے بڑے ایشوز کا ایک خاکہ سا پیش کردوں۔اقلیتوں کے لیے ٹیکسٹ بکس۔یہ ایشو بہت بڑا ایشو ہے، جو اقلیتوں کے ساتھ عدم برداشت پیدا کرتا ہے۔دوسرا ایشو یہ کہ امتیازی رویہ اساتذہ کے ہاں خود بھی نظر آتا ہے، یہ بہت تکلیف دہ عمل ہے۔تیسرا ایشو، تعلیم ہی میں یہ ہے کہ جو رعائتی نمبر حافظِ قران طلباء کو ملتے ہیں اور دوسروں کو نہیں ملتے، جو بچے وہ نمبر حاصل نہیں کر سکتے، وہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی امتیاز کی وجہ سے انہیں یہ نمبر نہیں ملے۔یہ وہ خاکہ ہے جس پر میں بات کروں گی۔اس کے ساتھ جو غیر مسلم ہیں وہ سیاسی طور پر کتنے متحرک ہیں، اس پر بھی بات کروں گی۔اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ سیاسی پارٹیوں کے اندر غیر مسلم کی نمائندگی کس

حد تک ہے نیز ان کی نمائندگی کس حد تک اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔آئین کے اندر اقلیتوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔اس پر بھی ایک نظر ڈالیں گے۔

ہم ٹیکسٹ بک سے اپنے بچوں کی ذہن سازی اس طرح کر رہے ہیں کہ وہاں سے بچے ایک دوسرے کے بارے جانتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے، یہ مسیح ہے، یہ شیعہ ہے، یہ سنی ہے وغیرہ۔ہمارا نصاب اس طرح امتیازات کو فروغ دیتا ہے۔پڑھانے والے بھی اس بات کا نوٹس لیے بغیر پڑھائے چلے جا رہے ہیں۔

اسی طرح اقلیتوں کو لئے آئین میں حد رکھ دی گئی ہے۔یعنی اگر وہ برابر کے شہری ہیں تو پھر انھیں صدر اور وزیر اعظم کے عہدے کیوں نہیں دیئے جا سکتے۔

سیاسی جماعتوں کے اندر اقلیتی ونگ ہیں مگر پارٹی کے عمومی عہدوں کے لئے انھیں قابل نہیں سمجھا جاتا نہ ہی جنرل نشستوں پر کسی غیر مسلم کو الیکشن کے لئے ٹکٹ دیا جاتا ہے۔کیا اس طرح سے انھیں قومی دھارے سے نکال نہیں دیا گیا۔

ایک اور پہلو جس کی وجہ سے اقلیتی طلبا کی حاصلہ شکنی ہوتی ہے وہ ان کے مقابلے پر حافظِ قرآن طلبا کو بیس اضافی نمبر دیئے جاتے ہیں۔جب آئین میں یہ طے ہے کہ آپ مذہب کی بنیاد پر کسی غیر مسلم کے ساتھ تعلیم میں کوئی فرق روا نہیں رکھیں گے تو پھر یہ کیا ہے۔

ایک اور مسئلہ تعلیمی نصاب کا ہے۔جس میں بہت سی ایسی چیزیں شامل کی گئی ہیں جس سے غیر مسلموں کی اور ان کے عقائد کی تضحیک کی جاتی ہے۔جب ایک ہی کلاس میں ان کے اساتذہ یہ سب کچھ پڑھا رہے ہوں گے تو پھر جو ماحول پیدا ہوگا کیا اس میں کوئی غیر مسلم بچہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا ہے؟

مقرر: وسعت اللہ خان

یہ جو ہم شدت پسند یا تنگ نظر ہوئے ہیں، یہ اپنے بزرگوں کی وجہ سے ہوئے ہیں۔بزرگوں سے مراد ہے، میڈیا کے بزرگ۔سینتالیس میں جب تقسیم ہوئی تو یہ کہا گیا کہ ہندو اکثریت، مسلمان اکثریت کو کچل رہی ہے، اس لیے الگ ملک چاہیے۔بن گیا۔آج ستر سالوں

میں ایسا لگتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا کچل دینے کا جو خوف تھا یہ اپنی جگہ پر تھا لیکن شاید ہمارے بزرگوں کے دل میں یہ تھا کہ اے ہندوؤ! ہمیں تمہاری تنگ نظری اور شدت پسندی منظور نہیں ہے ہم اپنی شدت پسندی اور تنگ نظری تخلیق کریں گے۔ ہمارا احساس ستر سال بعد یہی بن رہا ہے۔ پچاس، ساٹھ، ستر کی آپ اخبارات کی فائلیں اٹھا کر دیکھیں خصوصاً اردو اخبارات کی تو بھارت پر بہت توجہ تھی۔ ایک سیٹ پیٹرن تھا۔ اگر بھارت کے کسی محلے میں کوئی چھوٹا موٹا فساد ہوتا تھا تو کم از کم آٹھ کالمی لیڈ لگتی تھی۔ اس لیے کہ نواں کالم نہیں ہوتا تھا۔ اور لیڈ کیا ہوتی تھی ''بھارت میں دوبارہ مسلم کش فسادات''۔ مسلم کش فسادات کی خبر کے کچھ عرصہ بعد کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ پتا چلتا کسی مسلمان محلے میں دو قصائی برادریوں میں جھگڑا ہوا پڑا، لیکن جلدی میں انہوں نے کہا کہ ایسا ہو نہیں سکتا، لہٰذا یہ مسلم کش فساد ہے۔ میں پہلی بار سڑسٹھ اڑسٹھ میں سکول گیا تھا، یقیناً وہ آج کے زمانے کی نسبت، زیادہ برداشت اور رواداری کا زمانہ تھا۔ اس کے باوجود میں ہندو اور بھارت میں تمیز نہیں کر پاتا تھا۔ میں جب پانچویں کلاس میں پڑھ رہا تھا تو ایک لڑکا جماعت میں نیا آیا تو ماسٹر صاحب نے کہا کہ اس کا نام ہے تنویر لعل، تو میرے ساتھ جو لڑکا بیٹھا ہوا تھا، اُس نے میرے کان میں کہا کہ یہ جاسوس ہے، میں نے کہا پتا نہیں، اب مجھے بھی نہیں پتا تھا کہ وہ جاسوس تھا یا کون تھا۔ بغیر سوچے سمجھے ہمارا مائنڈ سیٹ اس وقت بھی بن گیا تھا۔ آج ہی کا ایک واقعہ ہے، میری فیملی بھی ساتھ آئی ہے، تو میرا چھوٹا بچہ جس کی عمر آٹھ سال ہے، وہ اپنی ماں سے راستے میں باتیں کر رہا تھا۔ کیا باتیں کر رہا تھا؟ وہ کرید رہا تھا کہ مری جہاں ہم جا رہے ہیں، وہاں چرچ ہے؟ بتایا، ہے۔ اُس نے پوچھا کیوں ہے؟ تو بتایا کہ یہاں انگریز ہوتے تھے، اُنہوں نے مری کو آباد کیا، تو پھر انہوں نے چرچ بھی بنالیا۔ اُس نے کہا کہ انگریز اب وہاں رہتے ہیں؟ بتایا کہ نہیں۔ پھر کہا کہ جب وہ نہیں رہتے تو پھر چرچ کیوں ہے؟

صحافیوں کی ایک خوبی ہے کہ یہ پڑھتے نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ان کا پیور نالج ہوتا ہے، کوئی آلودگی نہیں ہوتی۔ جو سنتے ہیں، اس کی سچائی پر یقین کر لیتے ہیں، انویسٹی گیشن کا کبھی رواج تھا، اب نہیں ہے۔ کوئی پریس ریلیز آجائے، اس میں پریس ریلیز کاٹ کر رپورٹر لکھ دیا جاتا ہے۔ کچھ ہوتے ہیں علماء جنہوں نے واقعتاً اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہوتی ہیں اور کچھ ہوتے ہیں

عالم نما، چونکہ صحافی پڑھتا نہیں ہے تو وہ عالم اور عالم نما میں تمیز بھی نہیں کر سکتا۔ عالم نرمی سے بات کرتا ہے اور عالم نما چونکہ عالم نہیں ہوتا تو دھڑلے سے بات کرتا ہے اور دھڑلے سے کی جانے والی بات پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ خود کش پڑھا لکھا نہیں ہوتا تو وہ اس کو چیلنج نہیں کر پاتا۔ پڑھے لکھے صحافی سے تقابلِ ادیان کا تقاضا کرنا جائز نہیں بنتا۔ مزید جو ظلم ہوا ہے وہ یہ ہوا ہے، پچھلے دس بارہ سال میں، ایک مخلوق پیراشوٹ سے اتری ہے، جس کو اینکرز کہتے ہیں۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم صحافی ہیں تو مَیں شرم کے مارے یہ نہیں کہتا کہ مَیں صحافی ہوں۔ اُن کے پاس ڈیسک کا تجربہ نہیں کہ کیسے خبر بنتی ہے، نہ وہ رپورٹر ہیں یوں وہ لکھ بھی نہیں سکتے، لیکن اُن کے پاس پروگرام کے گھوڑے کی باگ ہے۔ لہٰذا گھوڑا جدھر لے جائے۔ ان کا سارا علم سنا ہوا ہوتا ہے، تو بعض مرتبہ بولتے ہوئے زبان پھسل جاتی ہے اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہاں سے معاملہ بگڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ میں سن اَٹھہتر سے صحافت میں ہوں۔ لگ بھگ چھتیس برس ہو گئے۔ اور میں اب جا کر اس قابل ہوا ہوں کہ آپ کے سامنے بیٹھ کر گفتگو کر سکوں۔ لیکن آج میڈیا کی دنیا میں ہو یہ رہا ہے کہ ایک چوبیس پچیس سال کا نوجوان آتا ہے اور وہ چھا جاتا ہے اور وہ عقل کل بھی ہوتا ہے۔ اس لیے عقل کل ہے کہ فیس بک اور ٹوئٹر پر اس کے ڈھائی تین لاکھ مداح ہیں۔ میں تو اس کو چیلنج نہیں کر سکتا، وہ کہے گا کہ تم کون ہوتے ہو، تم کو کتنے جانتے ہیں، مجھے تو شاید چار سو بھی نہ جانتے ہوں۔ یہ عالم نما سے بھی آگے کی شکل ہے۔ اور یہ ہمیں دین سکھا رہے ہیں، عدم برداشت کا فلسفہ اور ہر چیز سکھا رہے ہیں۔ میڈیا کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں مسلمان ہر جگہ پِٹ رہے ہیں اور غیر مسلم ان پر ظلم کر رہے ہیں۔ چاہے وہ برما ہو، شام ہو، کشمیر ہو، فلسطین ہو وغیرہ۔ میں یہ بات سو فیصد مان لیتا ہوں کہ ایسا ہی ہے تو جو مسلمان، مسلمان کو مار رہا ہے تو پھر بھی آپ اتنا ہی شور مچائیں، لیکن کہا جاتا کہ نہیں ایسا کرنے سے نفاق پھیلے گا، ایسا کرنا مناسب نہیں ہے، بدنامی ہوتی ہے۔ غیر مسلمان ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ اور نہیں نہیں یہ کسی مسلمان کا کام نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کے اندر ہمارا یہ رویہ ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میرا ناک ٹیڑھا ہے، تو اس میں کوئی کشش نہیں ہو گی۔ ظاہر ہے کہ میرا ناک ٹیڑھا ہے۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میرا ناک ٹیڑھا نہیں ہے تو میرا ناک موضوع بحث بن جائے گا۔ لہٰذا جب آپ صحیح کو صحیح کہتے ہیں تو یہ خبر نہیں

ہوتی۔اسلامک انٹرنیشنل یونی ورسٹی اسلام آباد میں ایک خودکش حملہ آور طالبات کی کینٹین میں گھسا تھا۔ایک جمعدار نے دیکھا کہ ایک مشکوک آدمی گھسا چلا آ رہا ہے تو اس نے پکڑ لیا،اور وہ پھٹ گیا،یوں جمعدار مارا گیا۔رات کو جیو نیوز پر نو بجے کے خبرنامہ میں اس کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔نیوز کاسٹر نے پورا واقعہ بتایا اور کہا کہ جمعدار اختر مسیح نے کرسچن ہونے کے باوجود سچے پاکستانی ہونے کا ثبوت دیا اور پاکستان پر قربان ہو گیا۔

آخری نشست

گروپ رپورٹس و آراء

صدارت: عمار خان ناصر

مصطفیٰ: پہلی تجویز یہ ہے کہ یہ سلسلہ چلتے رہنا چاہیے۔ہمارے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی بلانا چاہیے۔تربیت کرنے والے اساتذہ کی مانیٹرنگ کرنی چاہیے کہ وہ کام کر رہے ہیں یہ نہیں۔اس سلسلے کو ملک تک پھیلا دینا چاہیے۔مختلف فرقوں کے لوگوں کے مابین مکالمہ کرانا چاہیے۔جو خواتین کے مدارس ہیں ان پر بھی کام کرنا چاہیے۔

واحد گل: پہلی تجویز تو یہ ہے کہ اسلامیات اور عربی کے ٹیچرز کے علاوہ جو ٹیچرز ہیں،اُن کو تربیتی کیمپ میں لایا جائے۔اُن کی بھی تربیت کی جائے۔

جاوید خان: یونی ورسٹی آف پشاور۔سماجی ہم آہنگی کے حوالے سے شرعی تعلیمات سے بچوں کو آگاہ کرنا چاہیے۔

محمد ظاہر شاہ: پشاور یونی ورسٹی۔استاد کا کلاس روم میں بھی کردار ہوتا ہے اور کلاس روم سے باہر بھی۔کلاس روم سے باہر جو کردار ہے اس میں اس کو ہم آہنگی کے شعور سے ہمکنار کرنا چاہیے۔دوسری تجویز یہ ہے کہ اس طرح کے پروگراموں کا دائرہ بڑھانا چاہیے۔

سیف اللہ: پشاور یونیورسٹی۔مسلکی ادارے جو ہیں وہ اپنے مسلک کو پروموٹ کر رہے ہیں۔مقصد دوسرے کو زیر کرنا ہے۔ہم یہ سنتے ہیں کہ بریلوی یہ کہتے ہیں،اہلحدیث یہ کہتے ہیں،اور

دوسرے مسلک والے یہ کہتے ہیں۔لیکن ہم خود کو نہیں دیکھتے۔مجھے افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ جو دینی مدارس ہیں یہ دینی نہیں مسلکی مدارس ہیں۔فرقہ واریت کے ادارے ہیں،دین کے نہیں۔زیادہ تر عدم رواداری یہاں سے پروموٹ ہو رہی ہے۔یہاں تجویز دی گئی کہ جدید ذرائع ابلاغ کو بروئے کار لایا جائے۔میں یہ کہتا ہوں کہ جو ہمارے مدرسین ہیں،اساتذہ ہیں،سکولوں،کالجوں اور مدرسوں کے،جب وہ ان کا استعمال ہی نہیں جانتے تو ان سے فوائد کیسے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ اسی طرح کے ان کے لیے سیشن رکھے جائیں جو آئی ٹی سے متعلق ہوں،جن سے وہ سیکھ سکیں کہ ٹیکنالوجی کو کیسے استعمال کرنا ہے۔سوشل میڈیا کو کیسے استعمال کرنا ہے۔مختلف سائیٹس کیسے اوپن کرنی ہیں۔اس طرح کے سیشنوں سے ان کی تربیت کی جائے۔

فرہاد اللہ: کوہاٹ یونی ورسٹی۔میں اس ادارے کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔یہ یونی ورسٹیوں کا کام ہے جو آپ کر رہے ہیں۔بچہ ابتدائی پانچ چھ سال والدین کے ساتھ گزارتا ہے۔اس کے بعد وہ سکول آتا ہے۔بچہ زیادہ وقت اپنی ماں کے ساتھ گزارتا ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ والدین اور خاص کر ماں کیسے بچے کے اندر ہم آہنگی کا رویہ پیدا کرتی ہے۔ماں باپ سے ہو کر بچے پھر سکولوں میں اساتذہ کے پاس آتے ہیں۔دوسری بات جو میں کہوں گا وہ اسلامیات کے اساتذہ کے حوالے سے ہے۔والدین سے بچہ جب سکول آتا ہے تو اس کی درست طریقے سے تربیت دیکھنے میں نہیں آتی یوں سب سے زیادہ جس استاد کی اہمیت بڑھ جاتی ہے،وہ اسلامیات کے اساتذہ ہوتے ہیں۔میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ بچے اسلامیات کے اساتذہ کے ساتھ زیادہ اٹیچ ہوتے ہیں یوں وہ ان سے زیادہ سیکھ سکتے ہیں۔اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اساتذہ کو اپنے مضمون پر دسترس ہونی چاہیے اس کے ساتھ ساتھ وہ بچے کی تربیت کا ہنر بھی جانتا ہو۔اساتذہ کو اپنا کردار یہاں بہ خوبی نبھانا چاہیے۔

☆ کسی بھی معاشرے میں اساتذہ کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے۔استاد کا تعلق طالب علم کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور معاشرے کے ساتھ بھی۔ایک استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچے

کے اندر برداشت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔اس کو برداشت کا درس دے۔اس کے ساتھ اس کی اپنی معلومات مکمل ہونی چاہیے ادھوری معلومات کے ساتھ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔وہ بچے کے سامنے دونوں نقطہ نظر رکھے اور کوئی ایک نقطہ نظر اس پر تھوپنے کے بجائے، سمجھا دیا جائے۔پھر اس کی مرضی کہ وہ کیا سیکھتا ہے۔طالب علم پر کوئی فکر لاگو نہیں کرنی چاہیے نہ کی جاسکتی ہے۔استاد اگر رواداری کا مظاہرہ کرے گا تو معاشرہ بھی کرے گا۔

امین اللہ: گورنمنٹ کالج لنڈی کوتل۔ایک تجویز یہ ہے کہ اس طرح کی ورکشاپس میں مختلف اور بڑے علماء اکرام کو شامل کیا جائے۔دوسری تجویز یہ دوں گا کہ کوئی ایسا رسالہ شائع کیا جائے تو مذہبی ہم آہنگی اور سماجی ہم آہنگی کے حوالے سے ہو۔جس کو مدارس، کالجز اور یونی ورسٹیوں تک رسائی حاصل ہو۔تیسری تجویز یہ دوں گا کہ اس وقت جتنے لوگ یہاں موجود ہیں وہ عہد کریں کہ آئندہ وہ سماجی ہم آہنگی کے لیے کام کریں گے اور خود بھی مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی پر کاربند رہیں گے۔

انصار مدنی: قراقرم یونی ورسٹی گلگت۔دو تجاویز دوں گا۔ایک تو یہ ہے کہ یہاں پر جو اساتذہ موجود ہیں وہ اسلامیات کے ہیں۔مثلاً ایسے ٹیچرز کو بلایا جائے جو میڈیا سے شغف رکھتے ہیں، کالم نگاری کا شوق رکھتے ہیں۔تا کہ جب وہ اس طرح کے سیمینارز میں آئیں تو زیادہ سیکھ کر جائیں اور پھر معاشرے میں جا کر بہتر کردار ادا کریں۔اس طرح کے ٹیچرز یہاں کے میسج کو اچھے طریقے سے پھیلا سکتے ہیں۔دوسری تجویز یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر ایسے لوگوں کا گروپ ہو جو ہم آہنگی کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں، یہاں پر جیسے لوگ موجود ہیں۔یہ سب سوشل میڈیا پر ایک گروپ کی صورت ہوں۔پھر آپ جیسے اداروں سے جو اچھی معلومات ہم تک پہنچیں ہم ان کو اپنے طالبِ علموں تک پہنچائیں۔

ڈاکٹر رشید احمد: پشاور یونیورسٹی۔یہاں کے زیادہ تر جو شرکاء ہیں وہ اس ادارے کے بارے زیادہ نہیں جانتے کہ یہ ادارہ کیا کرتا ہے۔میں عامر رانا صاحب کے بارے جانتا ہوں۔ان کے آرٹیکل پڑھتا ہوں۔لیکن ادارے کے بارے زیادہ نہیں جانتا۔اگر پروگرام شروع

ہونے سے پہلے کوئی پانچ منٹ کی ڈاکومینٹری دکھا دی جائے تو ہمیں معلوم ہو سکے گا کہ ادارہ کیا کرتا ہے۔اسی طرح یہاں عمار خان ناصر بیٹھے ہیں، میں ان کے والد صاحب کو جانتا ہوں کہ وہ بڑے عالم دین ہیں۔ان کا جو رسالہ ہے، اس میں آپ چاہے ان کے فکر سے مختلف لکھیں تو وہ چھاپتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہم آہنگی کا بہترین نمونہ ہے۔ایک تجویز یہ دوں گا کہ تجزیات آن لائن میں ہم آرٹیکل پڑھتے رہتے ہیں، تو خواہش ہے کہ یہاں کے شرکاء نے جو خوبصورت باتیں کی ہیں، وہ وہاں شائع کی جائیں تا کہ ان سکالرز کی باتوں سے مزید استفادہ کیا جاسکے۔

شفیق احمد: میری تجویز یہ ہے کہ حکومت، سکول، کالجز اور یونی ورسٹی کی سطح پر اس طرح کی ورکشاپ کا اہتمام کرے۔اساتذہ اور طالب علموں کے مابین دوستانہ ماحول پیدا کرے۔تا کہ ہم آہنگی کو یقینی بنایا جائے۔

مجیب الرحمٰن، گورنمنٹ کالج کرم ایجنسی۔۔۔ہم نے اس سیمینار سے بہت سیکھا۔ان دو دنوں کے اندر۔کل بھی ہم نے گروپ کی صورت میں ہم آہنگی پر بحث کی تھی اور کہا تھا کہ سماج اور ریاست میں فاصلے ہیں۔ان فاصلوں کی وجہ سے ہم آہنگی یقینی نہیں ہو پا رہی۔میری تجویز یہ ہے کہ نصاب میں ہم آہنگی اور مذہبی رواداری پر مبنی لٹریچر شامل کیا جائے تا کہ سماج میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔

سمیع اللہ: پشاور۔جو ادارے سماجی ہم آہنگی پر کام کر رہے ہیں مذہبی رواداری پر کام کر رہے ہیں، ان کو ایک دوسرے سے باہم منسلک ہونا چاہیے۔ان کے درمیان رابطہ ہونا چاہیے۔تا کہ بہتر نتائج حاصل کیے جاسکیں۔

شیر علی۔اقلیتوں کے بارے میں ہم سنتے ہیں کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے، تو میری تجویز یہ ہے کہ ایسے سیمینارز میں ان کی نمائندگی ہونی چاہیے۔تا کہ ہم خود ان کو سن سکیں ان سے پوچھ سکیں کہ ان کے مسائل کیا ہیں تا کہ مسئلے کی حساسیت کو اجاگر کیا جا سکے۔دوسری بات یہ ہے کہ گروپ سرگرمی کے لیے یہاں زیادہ وقت دیا جائے۔

زبیر حسین شاہ: پرنسپل گورنمنٹ کالج اَٹک۔ایک تجویز یہ ہے کہ جو اچھی باتیں ہوئی ہیں،ان کو کسی کتاب یا رسالے کی صورت چھاپ دیا جائے۔اس کے علاوہ سوشل میڈیا ونگ بنایا جائے،واٹس ایپ پر سب کے نمبر ایڈ کیے جائیں اور ایک گروپ ہو تا کہ سب ایک دوسرے سے منسلک رہیں اور پتا چلتا رہے کہ ادارہ کیا کر رہا ہے۔اس طریقے سے ہم قبلہ ایاز، خالد مسعود، عامر رانا، خورشید ندیم، عمار خان ناصر سے مستفید ہو سکیں۔یہاں تجاویز مانگی جائیں تو لوگ تبصرے شروع کر دیتے ہیں۔

سفارشات

عمار خان ناصر:

اس موضوع کی جو جزیات اور تفصیلات ہیں،وہ سامنے آ گئی ہیں۔میری جو چند منٹ کی سفارشات ہیں اس میں، میں چاہتا ہوں کہ اس پوری بحث کے حوالے سے، یہ مسئلہ کیا ہے،اس مسئلے کی جڑیں کہاں ہیں،اور وہ کس حد تک پھیلا ہوا ہے، یہ سب ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔میں چند نکات آپ کے سامنے عرض کرنا چاہوں گا۔پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ جو مسئلہ ہے،عدم برداشت کا، سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کے فقدان کا، یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ آنے والے وقت میں ہمارے سماج نے ترقی کرنی ہے یا تنزلی کی طرف جانا ہے، وہ اس مسئلے سے طے ہونا ہے۔سماج کا رخ کس طرف ہونا ہے۔تعمیر کی طرف جائے گا یا تخریب کی طرف۔ یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔اگر ہم نے غور سے نہ سمجھا تو یہ غیر ذمہ داری ہوگی۔دوسری بات اہم یہ ہے کہ یہ کسی خاص طبقے کا مسئلہ نہیں، یہ پورے سماج کا مسئلہ ہے۔ ہر طبقہ اپنے دائرے میں اس کو اپنی ڈومین سمجھتا ہے۔بہ حیثیت مجموعی جو رویہ ہے، یہ کسی خاص کا مسئلہ نہیں پورے سماج کا ہے۔البتہ کچھ طبقے جو اس سے مخصوص ہیں، وہ زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔جسے ہم عدم رواداری کے حوالے سے سماجی تقسیم کہہ رہے ہیں یہ تقسیم بھی کسی ایک مسئلے کے حوالے سے نہیں ہے، ہمارا پورا سماج تقسیم کا شکار ہے۔بعض دفعہ جو مسلمانوں کے مابین عدم ہم آہنگی کا مسئلہ ہے وہ زیادہ توجہ میں آ جاتا ہے، صبح ہم نے یہاں گفتگو سنی کہ ایک غیر مسلم کو ہمارے ہاں کیا مسائل ہیں، تو اس صورت یہ

مسئلہ سامنے آتا ہے۔اگر ہم اپنے سماج کے سٹرکچر یا ساخت پر غور کریں تو ہر جگہ یہ مسئلہ ہمیں درپیش ہے۔اقتدار کے حوالے سے دیکھ لیں، اہلِ اقتدار اور اسٹیبلشمنٹ کی تقسیم الگ مسئلہ ہے۔سیاسی جماعتوں کے درمیان منافرت ہے، یہ ایک مسئلہ ہے۔حکمرانوں اور عوام کے مابین فاصلے ہیں۔سماج میں کئی طبقے ہیں، اس میں عدم رواداری کے کئی مظاہر ہیں، فکری حوالے سے معاشرہ تقسیم ہے، مذہبی اور غیر مذہبی لوگوں میں تقسیم ہے۔لوگ خاندان میں بٹے ہوئے ہیں، وہاں تنازعات ہیں۔یہ کینوس ہمیں سامنے رکھنا چاہیے کہ پورا سماج تقسیم ہے۔ ہر جگہ ہر مقام پر تقسیم ہے۔تیسری بات جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم رواداری کی بات کرتے ہیں، یہ رکھ رکھاؤ کا نام نہیں، رویہ بنیادی طور پر ذہنی ہے، اگر آپ ذہنی طور پر لچک رکھتے ہیں، تو اس حوالے سے جو رویہ سامنے آئے گا وہ حقیقی ہوگا۔اگر آپ کا رویہ ذہنی لچک پر نہیں تو یہ منافقت بھی اوڑھ لیتا ہے۔ہمیں فکری اور ذہنی آزادی کا قائل ہونا پڑے گا۔اگر ہم اپنے ذہنی رویّوں میں لچک نہیں رکھتے تو رواداری کے مظاہر رونما نہیں ہو سکتے۔اگر ہوں گے بھی تو وہ پائیدار نہیں ہوں گے۔اس نقطے کے ساتھ جڑی ہوئی ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ فکر اور سوچ میں رواداری پیدا ہو تو وہ ساری بحث متعلقہ ہو جائے گی جو خورشید ندیم صاحب نے اپنی بحث میں اٹھائی تھی۔جب تک افکار میں کلیئرٹی نہ ہو، اس میں ابہام میں ہو تو کردار میں بھی ابہام رہے گا۔لہٰذا افکار میں، سوچوں میں کلیئر ہونا ضروری ہے۔حقیقی رواداری کیسے پیدا ہوگی اس کے لیے ہمیں درست تناظر میں چیزوں کو دیکھنا اور سمجھنا پڑے گا۔ریاست کیا ہوتی ہے، قومی ریاست کیا ہوتی ہے، اسلام نے کیسے تاریخی سفر طے کیا، کیا کیا چیزیں اس کے اندر شامل ہوتی رہیں، وغیرہ جو نکات قبلہ ایاز، خالد مسعود، اور خورشید ندیم نے بیان کیے ہیں، ان پر گہرائی سے غور و خوض کرنا ہوگا۔اس طرح جو حقیقی رواداری ہے وہ قائم ہو سکے گی۔آخری بات یہ کہ بلکہ دو باتیں کہہ کر اجازت چاہوں گا کہ اس حوالے سے منظر بہت مایوس کن ہے لیکن جو اصل راستہ نکال رہے ہوں، انہیں کسی طور پر مایوسی نہیں پھیلانی چاہیے۔اساتذہ کو ایسا جملہ بھی نہیں کہنا چاہیے کہ صورت حال مایوس کن ہے۔رجائیت ضروری ہے۔جب ہم معاشرے کی تصویر پیش کریں تو اس طرح منفی پہلو ہائی لائٹ نہ کریں کہ مثبت پہلو دب جائیں۔جب ہم منفی باتیں کریں تو امکانات کی بات بھی کریں۔اور

آخری سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ جو اصلاح ہے، یعنی ہم آہنگی پیدا کرنا تو اس کے لیے کسی خاص طبقے کو اپنی طرف متوجہ کرنا یا کام شاید قابل عمل نہیں ہے۔ یہ کام ایسا ہے کہ ہر ہر سطح پر ہر ہر ایک پر کرنا چاہیے۔ یہ کسی خاص طبقے کا جس کے پاس اتھارٹی ہے، کا مسئلہ نہیں ہے۔ اگر کوئی گلی محلے میں جھگڑ پڑا ہے تو ان کے درمیان میں، صلح کرادی جائے تو یہ ہمارا رواداری کے لیے حصہ ہوگا۔ یہ ہر ہر طبقے کے کرنے کا کام ہے۔ اس طرح کریں تو اصلاح کا امکان ہے۔ آخری بات یہ کروں گا کہ پانچ طبقات ایسے ہیں جن پر ذمہ داری زیادہ پڑتی ہے۔ میرے پاس تین تجاویز ہیں۔ علماء کا طبقہ ہمارے معاشرے میں یہ کردار ادا کرتا رہا ہے، جو ہمارے معاشرے کے تنازعات اور تقسیم ہوتی تھیں، وہ ان کا حصہ نہیں ہوتے تھے۔ اور ایک طرف کھڑے ہو کر وہ تنازعات کے حل میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ جبکہ دو فریق تنازع میں شامل ہو جائیں تو ایک فریق کا دوسرے کو متاثر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ہماری تاریخ میں صوفیاء کا علماء کا کردار یہ تھا کہ وہ اپنے علم اور مذہبی پس منظر سے جو ان کو احترام میسر تھا، اس سے وہ تنازعات ختم کرواتے تھے۔ دوسری چیز جو اہم ہے وہ یہ کہ جو مختلف طبقے جن کا ابھی ہم نے ذکر کیا۔ ان کے درمیان کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو مکالمے کو فروغ دیں۔ آخری بات یہ ہے کہ سماج میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو قائدانہ صلاحیتیں رکھتے ہیں اور وہ سماج میں کردار ادا کر سکتے ہیں، ان کی صلاحیتوں کی تعمیر کی جانے چاہیے۔

محمد عامر رانا

بہت بہت شکریہ عمار خان ناصر صاحب۔ آپ سب کا بہت شکریہ۔ یہاں بہت اہم سوالات سامنے آئے، عمار خان نے تقسیم کی بات کی۔ پورے سماج کی تقسیم کا اہم مسئلہ ہے۔ ہر شعبے کے اندر کسی نہ کسی سطح پر سازشیں جاری ہیں۔ پاکستان ان ملکوں میں شامل ہے جہاں سماجی تشکیل کی صورتِ نو پیدا ہوئی ہے۔ ہم اس وقت تشکیل نو کے مرحلے کے اندر ہیں۔ خاص طور پر جب کسی سماج کی بنیادیں مذہبی بنیادوں کے اوپر استوار ہو رہی ہوں۔ تو بطور ادارہ اور فرد ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ جو ہمارے دوست جیسے، خورشید ندیم صاحب، ڈاکٹر خالد مسعود صاحب، اور قبلہ ایاز صاحب ہیں، کہ ہم کیسے اس مرحلے کے اندر اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔ یہ بڑی اہم ذمہ داری

ہے۔ مکالمہ آج کی دنیا کی قوت ہے، ہم اس کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ جو مدارس کے پوزیشن ہولڈرز طلبا ہیں، یونیورسٹی کے جو طلباء ہیں، ان کے درمیان مکالمہ اور بات چیت کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ بہت سارے گروپ اس طرح کا کام کر رہے ہیں، خورشید صاحب کا ادارہ اس طرح کی کوششیں کر رہا ہے۔ چیلنج بہت زیادہ ہیں۔ چونکہ سماج تشکیل نو کے مرحلے میں ہے تو تنقیدی اور بحث طلب سوالات کو چھیڑنا از حد ضروری ہے۔ یہ نہ ہو کہ جب اس قسم کی گفتگو اور مکالمے کا دوبارہ موقع پیدا ہو تو ہمارے اوپر بہت ساری رکاوٹیں لگی ہوں کہ اس پر بات نہیں کی جاسکتی۔ یہ سوال آج کے بعد نہیں اٹھایا جائے گا۔ اس چیز کے اوپر تو بات ممکن ہی نہیں ہے۔ تو میرا خیال ہے اس مسئلے کو توڑنے کے لیے مکالمہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ بعض دفعہ مکالمے کو مہمیز دینے کے لیے بہت زیادہ تنقیدی نوعیت کی بات کرنا ضروری ٹھہر جاتا ہے۔ ہم محسوس تو کر رہے ہیں اپنی زندگی کے اندر لیکن ہم اس کو بیان نہیں کر پا رہے ہیں۔ ہم نے یہ ابھی نیا سلسلہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ شروع کیا، یقیناً ہم آپ کی کاوشوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔

چند سلائیڈ ہیں پوری دنیا کے اندر مسلم سماج کے بارے میں آپ کو لگے گا کہ شریعت کے لیے ان کی تگ و دو کیا ہے۔ پاکستان کے عموماً بڑے مدارس کے لوگوں کی خواہش ہے کہ ملک میں شرعی نظام نافذ ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا بیانیہ بھی کافی مضبوط ہے۔ پاکستان کے بارے میں بیرون ملک میں جو تصور ہے اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں جو غیر مسلم ہیں کیا وہ اپنے کو یہاں محفوظ سمجھتے ہیں' جہاں پر وہ کام کرتے ہیں یا جہاں ان کا تعلق سماج کے ساتھ ہوتا ہے انہیں کس قسم کے رویّوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر ہمارے ہاں عیسائی اور سکھ کمیونٹی کے ہاں یہ شکایت بہت عام ہے کہ انہیں کام کرنے کی جگہوں پر اور سماج میں مختلف قسم کے ہتک آمیز رویّوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ تعداد ہندوؤں میں بھی خاصی زیادہ ہے۔ لیکن اس کے اندر زیادہ کوئی خوشی کی بات نہیں ہے کیونکہ جو 42 فیصد ہیں ان کے اندر سے جو 35 فیصد سے زائد لوگوں کی کام کی نوعیت ایسی ہے جنہیں سماج کے ساتھ بات کرنے' تال میل اور بات کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کو اس بات پر بھی خوش ہونے کی ضرورت نہیں کہ 70 فیصد ہندو پاکستانیوں سے ملنے جلنے پر خوش ہیں۔ اس 70 فیصد سے زیادہ تر تعداد وہ ہے

جنہیں مسلمانوں سے کاروبار اور دیگر سماجی تعلق کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارے علم میں یہ بھی ہے کہ پاکستان کی سکھ کمیونٹی جس قسم کے بزنس کے اندر ہے وہ سماجی اعتبار سے بالکل مختلف نوعیت کے ہیں، اسی طرح بہائی کمیونٹی بھی۔ تو کیا ہمارا مذہبی فریضہ ہونا یا تعریف کا تقاضا کرتا ہے کہ جو ہمارے ہاں کمزور مذہبی' سماجی طبقات ہیں کہ وہ عدم تحفظ کا شکار ہوں۔ کیا ہم نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ پاکستان بنتے وقت یہاں پر 26 فیصد تک غیر مسلم آباد تھے اور اب ان کی تعداد کم ہو کر 6 فیصد تک رہ گئی ہے۔ کیا ہم نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش کی ہے کہ جب پاکستان بنا تب تو اس کا قیام اقلیتی طبقوں کے مفادات کا تحفظ تھا' پاکستان بننے کے بعد کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف اقتدار کا انتقال ہوا ہو اور باقی ہمارے سماجی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہو' ہم بار بار انڈیا کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ کیا ہمارے سماج میں بھی سماجی رویے اتنی شدت کے نہیں ہیں جتنی شدت کے انڈیا میں ہیں' اس حوالے سے بہت سے شواہد اور سروے موجود ہے۔

دو سلائیڈ میں آپ کے ساتھ اور شیئر کرنا چاہتا ہوں' ہم مسلمان یورپ کے بارے میں اور دوسرے غیر مسلموں کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ ورلڈ ویو ہمارا بہت اہم ہے۔ بار بار دبے لفظوں میں یہاں پر ذکر ہو رہا ہے۔ ہماری ریاستیں اتنی لاچار ہیں' ہمارے معاشرے اتنے بانجھ ہیں' سیاسی شعور سے اتنے نابلد ہیں کہ کوئی بھی آ کر ان کے گلے کے اندر نہ نظر آنے والی باریک سی ڈوری سے ہمارے مسلم سماج کو ہلانا شروع کر دیتا ہے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ ہماری رائے اپنے علاوہ دوسرے لوگوں کے بارے میں اتنی منفی کیوں ہے۔ ان کے اندر وہ کون سی تعلیم ہے' وہ کون سے رویے ہیں' وہ کون سے اندرونی اور بیرونی دباؤ ہیں جن کو ہم اختیار کرتے ہیں جو ہمارے ورلڈ ویو کو مثبت نہیں رہنے دیتے اور باقی سماج سے ہمیں توڑ کر رکھ دیتے ہیں' یہ چند گزارشات ہیں۔

سوالات:

محمد سعید خان ایسوسی ایٹ پروفیسر (کرک): میرا سوال عدم برداشت کے حوالے سے ہے۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ دوسرے مذاہب کے اکابرین اور محترم ہستیوں کو برا بھلا نہ کہیں کیونکہ وہ لوگ غصے میں آ کر آپ کی مقدس ہستیوں کو برا بھلا کہیں گے اور ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک غیر مسلم خاتون نبی کریمؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکا کرتی تھی۔ دو تین دن تک اس خاتون نے کوڑا نہ پھینکا تو آپؐ نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ اب وہ خاتون مجھ پر کوڑا کرکٹ نہیں پھینک رہی تو صحابہ کرام نے عرض کیا وہ بیمار ہے۔ آپؐ اس خاتون کی تیمارداری کے لیے تشریف لے گئے۔ وہ خاتون اس قدر متاثر ہوئی کہ مسلمان ہو گئی' اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

خدیجہ حفیظ:

میرا سوال یہ ہے کہ سماجی ہم آہنگی کے لیے اس وقت میں انسان بھی ہوں' مسلمان بھی اور پاکستانی بھی۔ اگر میں خود کو صرف انسان کہنا شروع کر دوں تو کیا سماجی ہم آہنگی ممکن ہو جائے گی' دوسرا یہ کہ انسانیت کا جو رشتہ ہے یہ اتنا اہم ہے کہ صرف 10 فیصد لوگ اپنے آپ کو انسان سمجھتے ہیں باقی جو اکثریت لوگوں کی ہے وہ اپنے آپ کو کسی مشن کے ساتھ منسلک تصور کرتے ہیں۔ کیوں؟

سوال:

جس طرح عامر صاحب نے فرمایا کہ عوام مذہبی شناخت یا پاکستان کی شناخت رکھتی ہے اس کی وجہ کیا ہے' اس کی وجہ استدلال کی بجائے اعتقادی ہے۔ ہمارے لوگوں کو یہ نہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیوں ایمان لائے ہیں۔ تیراہ ہمارا ایک علاقہ ہے وہاں ایک مولوی صاحب نے اپنے نمازیوں کے سامنے جہنم کا تذکرہ شروع کیا تو سانپ اور بچھو کا ذکر تفصیل سے کیا۔ نمازیوں نے یہ تو سنا تھا کہ جو مسلمان ہے وہ جنت میں جائے گا تو نمازی پریشان ہوئے اور اس امام صاحب کو ایک گالی دی کہ یہ امام صاحب گپ لگا رہا ہے' اس کے علاوہ حقیقت کچھ بھی نہیں۔ تو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اعتقادی ایمان ایسا ہی ہوتا ہے۔

میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ لوگ مذہبی شناخت کیوں رکھتے ہیں؟

عامر رانا:

میں نے آپ لوگوں کے سامنے سوالات رکھے لیکن میرے پاس کسی بھی سوال کا جواب نہیں آیا۔ میرا ایک اور سوال ہے، اقلیتوں کے ساتھ یہاں جو سلوک کیا جاتا ہے، سماجی بدامنی ہے، کیا اس کا تعلق مذہبی شناخت سے ہے ہے۔ اگر نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟

انصار:

میرا سوال اس واقعہ سے ہے کہ معاشرے میں منفی رویّوں کے خاتمے کے لیے کوئی نظام بنا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں بنا تو اس قسم کے تعلقات میں ہمارے ہاں کیسے بہتری آ سکتی ہے؟

سوال:

ڈاکٹر صاحب سے سوال ہے کہ بیان لکل شئ ان دونوں کی تفسیر بیان فرمادیں۔

جواب: قرآن مجید کی 500 آیات احکام کی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید میں صرف احکام ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہیں اور بیان لکل شئ کا مطلب ہے کہ اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں سوالات تھے ان کے جوابات دیے جائیں۔ بہت سے ایسے حوالے موجود ہیں کہ اس وقت لوگ مختلف امور سے متعلق سوالات کرتے تھے، ایک تو یہ کہ لوگوں کے ذہنوں میں جو سوال ہے اس کو واضح کریں دوسرا نقطۂ نظر بہت مخصوص ہے کہ اس کا موضوع مخصوص ہے، اس میں ہر چیز کا بیان ان معنوں میں نہیں کہ نہ تو وہ کتاب ہے تاریخ، نہ قانون، نہ فلسفہ، جو اہم سوال ہو سکتے ہیں ان کا تسلی بخش جواب موجود ہے۔ بیان لکل شئ اور الیوم اکملت لکم دینکم آیت کے تحت تفسیر میں ایسے سوالوں کا جواب دیا ہے کہ کیا قرآن میں ہر بات کا جواب موجود ہے؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید میں اگر اللہ تعالیٰ نے بنیادی باتوں کا ذکر کر دیا ہے باقی چیزوں کا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ کیا پچھلی امتوں کا اجماع واجب ہے یا نہیں؟ یہ بیانیہ اس وقت سے ہے کہ قرآن مجید ایسی نص سے تعلق رکھتا ہے جو نص اصلی ہے، جو قطعی ہے۔ یہ چند لوگوں کی طرف ایک مخصوص دور ایسے میں سوال اٹھایا گیا تھا کہ قرآن میں تمام مسائل کا حل موجود ہے جب کہ ہمارا اپنا عقیدہ یہ

ہے کہ قرآن مجید اجمال کو بیان کرتا ہے اور مخصوص مسائل کو بیان کرتا ہے۔

سوال: کیا اسلام کا تعلق اس مخصوص زمانے سے ہے جب نبی کریمؐ پر کتاب نازل ہوئی، اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: اس کے دو جواب ہیں، ایک تو لفظ کل کا معنی اور دوسرا اس کا مفہوم کیا ہے؟ لفظ کل کا جو معنی ہے وہ ان پڑھ نہیں اس میں خود قرآن میں علیون کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہ صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے نہیں بلکہ ہر کسی کے لیے ہے۔ اس کا سیاق وسباق یہ ہے کہ یہود اور مشرکین کے ساتھ مسلسل مناظرے ہیں کیونکہ یہ دونوں گروہ موجود تھے۔ مکہ میں بھی مدینہ میں بھی۔ خاص طور پر یہودیوں کے ہاں ایک لفظ استعمال ہوتا تھا کہ یہودیوں کے علاوہ باقی ایک طبقہ ہے جو ان پڑھ ہے۔ دوسرا سیاق مفہوم کا ہے کہ اس میں یہ سوال پیدا ہوا اور قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے کہ رسول کریمؐ نے خود لکھ لیا ہے۔ اب مغرب کے لوگوں کو بھی سمجھ نہیں آتا کہ رسول کریمؐ نے خود کیسے لکھا۔ دوسرا وحی کا تصور کہ رسول کریمؐ نے اپنے الفاظ میں یا وہی الفاظ میں جو من وعن وحی کے تھے ہمارے علماء کا بھی اس بارے میں مختلف آراء ہیں کہ جو وحی تھی کیا وہ الفاظ میں تھی یا معانی میں تھی۔ یہ بحث ہمارے ہاں موجود ہے۔ اس میں جو مسئلہ بنتا ہے وہ یہ کہ رسول کریمؐ اُمی (ان پڑھ) تھے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ان پڑھ کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ امام شافعی نے ایسے بیسیوں عالموں کا ذکر کیا ہے کہ جن کا تعلق لکھنے پڑھنے سے نہیں لیکن اس کے باوجود وہ عالم ہیں۔ اگر آپ لفظی مفہوم لیں کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو ٹھیک لیکن روحانی اعتبار سے یہ مفہوم درست نہیں ہے۔

تیسرا مفہوم: رسول کریمؐ کے بارے میں یہ کہنا کہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے تو اس بارے میں قرآن مجید کہ رسول کریمؐ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں۔ دوسرا ایک حدیث میں ہے کہ ''ما انا بقاری'' اس کا مفہوم اکثر لوگ یہ لیتے ہیں کہ ''میں پڑھا لکھا نہیں ہوں'' لیکن اس کے باوجود حضرت جبرائیل نے جب آیت پڑھی تو آپ نے اسے پڑھا، تو پڑھنے کے معانی دو طرح کے آتے ہیں، ایک یہ کہ آپ لکھا ہوا پڑھیں اور ایک یہ کہ آپ اسے اپنی

زبان سے ادا کریں۔ تیسرا حدیبیہ کا واقعہ ہے جس میں اس بات پر بحث ہوئی کہ اس معاہدے پر رسول کریم کا نام لکھیں یا نہیں؟ تو حضرت علی نے کہا یہ نہیں کر سکتے آپ کا نام نہ لکھا جائے۔ تو رسول کریمؐ نے خود وہ نام مٹا دیا۔ اسرائیل میں ایک عالم ہیں جنہوں نے اس پر بحث کی ہے کہ اس میں اس کا مطلب ان پڑھ نہیں ہے۔

خورشید ندیم: آخر میں، میں چاہوں گا کہ جو ساری گفتگو ہوئی یہاں، اس کو کچھ تلخیص اور اضافوں کے ساتھ بیان کر دوں تا کہ ہم اس میں کچھ متعین کر سکیں کچھ نتائج اخذ کر سکیں۔ دو بنیادی باتیں ہوئیں۔ ایک یہ ہے کہ جس عہد میں ہم جی رہے ہیں، اس عہد کا سماجی تناظر کیا ہے۔ اور اس میں بطور مسلم ہم اپنی شناخت برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں کس طرح کی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ جو بیانیے ہم نے اختیار کیے تھے، ان سے ہمیں اس وقت کیا مسائل ہیں اور ان پر کیسے نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ عامر رانا نے کچھ شواہد کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ دنیا ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کر رہی ہے اور ہمارے معاشرتی رویّے جو پروان چڑھ رہے ہیں، وہ کیا ہیں۔ میں اسی بات کو آگے بڑھاؤں گا، اس نقطے کے ساتھ کہ اب دنیا میں غور کریں تو دو سماجی تناظر ہیں، ایک تناظر قومی ریاست کا ہے، آپ پاکستان کے شہری ہیں، آپ پاکستان کے ماحول کی، پاکستان کے نظام کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں، جس میں آپ رہتے ہوئے سیاسی وسماجی پُرامن زندگی گزار سکیں۔ ایسے نظام میں جہاں جان ومال کا تحفظ ہو، کسی کو کسی سے خطرہ نہ ہو۔ دوسرا تناظر جو ابھی چند برسوں کے اندر پیدا ہو گیا ہے، وہ یہ کہ ہم ایک گلوبل ویلج کے بھی شہری ہیں، وہ تناظر ایسا ہے جس کو نظر انداز کرنا اب ممکن نہیں رہا کہ بین الاقوامی سطح پر باہمی میل ملاپ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کی کئی جہتیں ہیں، اس میں ایک سماجی تعلقات کی جہت ہے، ایک معیشت کی جہت ہے، تعلیم کی ایک جہت ہے۔ ایک دوسرے پر انحصار اتنا بڑھ گیا ہے کہ جو گلوبل تناظر ہے جس کے اندر ہم ایک شہری کے طور پر جینا چاہتے ہیں، اُس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں حیثیتوں نے ہمارے سامنے کچھ سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔ کچھ سوال ایسے ہیں جن کو

نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا جو روایتی دینی فہم ہے، وہ بدقسمتی سے ہماری کوئی زیادہ مدد نہیں کر رہا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ملک میں تقسیم ہے جس کی وجہ سے عدم برداشت کا ماحول پیدا ہو گیا ہے اور اس تقسیم سے نمٹنے میں بری طرح عاری ہیں۔ ایک تقسیم ہے وہ لبرل اور مذہبی طبقے کی تقسیم ہے۔ کچھ لوگ لبرل بنیادوں پر سماجی وسیاسی زندگی چاہتے ہیں، کچھ لوگ مذہبی پیراڈائم میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں کے نقطہ نظر میں اختلاف ہے۔ دونوں طبقوں کے درمیان سوشل میڈیا، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا پر بحث جاری ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ جو مسلکی تقسیم ہے، یہ امرِ واقعہ ہے۔ یہ جو شیعہ سنی کی تقسیم ہے، یہ کوئی عام تقسیم نہیں ہے۔ یہ بہت گہری تقسیم ہے۔ یہ جو مسلکی تقسیم ہے، اس نے امن اور ہم آہنگی کے لیے بہت مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ یہ جو فکری بنیاد پر اتنے گہرے تضادات موجود ہیں، ان کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب نے مولانا غزنوی اور مولانا احمد علی کا واقعہ سنایا، بہت اچھا واقعہ ہے۔ لیکن میرے ذہن میں کچھ سوالات ہیں، یہ جو احناف اور اہلحدیثوں کے درمیان محبت کا یہ جو واقعہ ہے، کیا ہم اس کی توسیع میں شیعہ سنی کو شامل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کیا یہ مذہبی ہم آہنگی جس کا مظاہرہ ہم نے اس واقعہ میں دیکھا، کیا یہ رفع یدین سے بڑھ کر، اس دائرہ میں ہم اور لوگوں کو شامل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نہیں ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔

تیسری ورکشاپ

01-02- جون کو مری میں ہونے والی
دو روزہ تربیتی ورکشاپ کی روداد

پہلا دن

نشست اوّل: تعارف، پس منظر اور لائحہ عمل

صدارت: ڈاکٹر قبلہ ایاز (سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی)

استقبالیہ کلمات: محمد عامر رانا (ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز)

شرکاء کا تعارف اور موضوع پر اظہار خیال اور گروپوں کی تشکیل

دوسری نشست: مسائل کی نشاندہی اور تجاویز

تیسری نشست: گروپ رپورٹس اور ان پر بحث

صدارت: مولانا راغب نعیمی (پرنسپل جامعہ نعیمیہ لاہور)

چوتھی نشست

صدارت: ڈاکٹر قبلہ ایاز (سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی)

مقررین: ڈاکٹر خالد مسعود (سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل)
خورشید ندیم (محقق، دانشور و کالم نگار)

دوسرا دن

پہلی نشست: عدم برداشت اور مذہبی رویّے

صدارت: ڈاکٹر خالد مسعود (سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل)

مقررین: عمار خان ناصر (مذہبی سکالر، الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ)
محمد عامر رانا (ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز)

دوسری نشست: مذہبی عدم رواداری اور عمومی رویّوں کا بگاڑ

صدارت:: خورشید ندیم (محقق، دانشور و کالم نگار)

مقررین: رومانہ بشیر (سماجی کارکن وایگزیکٹو ڈائریکٹر پیس اینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن)
وسعت اللہ خان (صحافی، کالم نگار واینکر پرسن)
جینی جینیفر (ڈائریکٹر کرسچئن سٹڈی سینٹر راولپنڈی)

آخری نشست

گروپ رپورٹس

صدارت: ڈاکٹر قبلہ ایاز (سابق وایس چانسلر پشاور یونیورسٹی)

......o......

شرکاء

1۔ ڈاکٹر شہباز منج: پروفیسر فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، یونیورسٹی آف سرگودھا

2۔ ڈاکٹر فیروز لگھا: پروفیسر فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، یونیورسٹی آف سرگودھا

3۔ ڈاکٹر آغا محمود احمد: اسسٹنٹ پروفیسر، فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، یونیورسٹی

آف سرگودھا

4۔ ڈاکٹر سید اظہار حیدر: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی، فیصل آباد یونیورسٹی

5۔ ڈاکٹر محفوظ احمد: ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ، سکول آف عریبک اینڈ اسلامک اسٹڈیز فیصل آباد یونیورسٹی

6۔ ڈاکٹر کلثوم سعید پراچہ: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، ویمن یونیورسٹی ملتان

7۔ قدسیہ خاکوانی: چیئر پرسن شعبہ اسلامیات وتقابل ادیان، ویمن یونیورسٹی ملتان

8۔ حمیدہ مظہر: ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ عربی، ویمن یونیورسٹی ملتان

9۔ ام کلثوم: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، ویمن یونیورسٹی ملتان

10۔ رقیہ بانو: اسسٹنٹ پروفیسر، ویمن یونیورسٹی ملتان

11۔ پروفیسر ڈاکٹر عبد الغفار بخاری: ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ شعبہ تاریخ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز

12۔ حافظ شعیب فاروق: لیکچرار فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز یونیورسٹی آف واہ کینٹ

13۔ میاں محمد مشتاق: لیکچرار شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ اسلامیہ کالج قصور

14۔ جمیل اختر: لیکچرار: شعبہ اسلامیات، گجرات یونیورسٹی

15۔ آفتاب احمد: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

16۔ ڈاکٹر نگہت اکرم: شعبہ اسلامیات، پونچھ یونیورسٹی راولاکوٹ

17۔ ڈاکٹر الطاف حسین لنگڑیال: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، بہاولپور یونیورسٹی

18۔ ڈاکٹر ارشد منیر: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، غازی یونیورسٹی ڈیرہ غازی خان

19۔ ڈاکٹر ایم عتیق الرحمٰن: ایسوسی ایٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف انجنیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور

20۔ ڈاکٹر صدف سلطان: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی لاہور

21۔ ڈاکٹر طاہر محمود: چیئرمین شعبہ اسلامیات، وفاقی اردو یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی

اسلام آباد

22۔ ثوبیہ خانم: لیکچرار، شعبہ اسلامیات، آزاد جموں وکشمیر یونیورسٹی مظفرآباد

23۔ راحیلہ خالد قریشی: چیئر پرسن، شعبہ عربی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

24۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

25۔ عبدالصمد ہارون شیخ: اسسٹنٹ پروفیسر، دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

26۔ ڈاکٹر ایم اویس سرور: ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ شعبہ عربی گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج لاہور کینٹ

27۔ سونیلہ حسین خان: لیکچرار عربی، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی لاہور

28۔ ایم عمران خان: لیکچرار اسلامیات: میر پور یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی میر پور آزاد کشمیر

29۔ ڈاکٹر مفتی عبدالرزاق: لیکچرار شعبہ اسلامیات، غازی یونیورسٹی ڈیرہ غازی خان

30۔ ڈاکٹر عبدالحسن شبیر: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامیات، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

31۔ ڈاکٹر حسن الامین: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ سیاسیات بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

32۔ حافظ محمد اجمل: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بورے والا

01-02- جون کو مری میں ہونے والی دوروزہ تربیتی ورکشاپ کی تصویری جھلکیاں

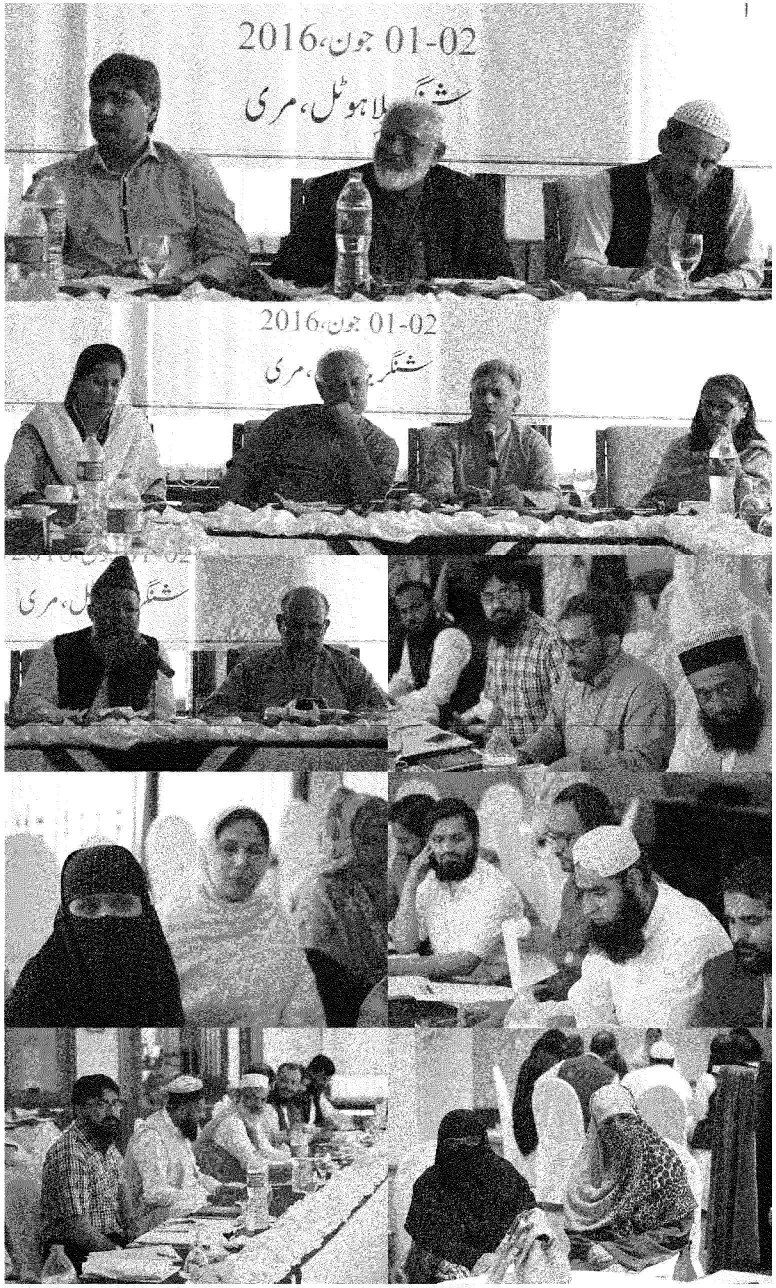

نشست اوّل: تعارف، پس منظر اور لائحہ عمل

صدارت: ڈاکٹر قبلہ ایاز

''سماجی ہم آہنگی و مذہبی ہم آہنگی میں اساتذہ کا کردار'' اس حوالے سے ہمیں آپ کی رائے درکار ہے تاکہ ہم آپ کے تجربات سے استفادہ کریں، آپ ہمیں بتائیں کہ اساتذہ مذہبی رواداری اور معاشرتی ہم آہنگی میں کیا کردار ادا کرسکتے ہیں۔

استقبالیہ کلمات: محمد عامر رانا

ہم یہاں کسی روایتی ورکشاپ کیلئے نہیں بلکہ ایک مکالمے کیلئے جمع ہیں اور ان سوالوں کے جوابات درکار ہیں جو بنیادی نوعیت کے ہیں۔ پاکستان کو جو چیلنج درپیش ہیں جن کا تعلق مذاہب سے نہ بھی ہو تو مذہبی جماعتوں اور مذہبی اداروں سے ضرور ہے اس چیلنج سے کیسے نبرد آزما ہوا جاسکتا ہے۔ اس کیلئے گزشتہ کئی سالوں سے ہمارا مکالمہ زندگی کے مختلف شعبوں اور بالخصوص علمائے کرام سے جاری ہے۔

شرکاء کا تعارف، موضوع پر اظہار خیال اور گروپوں کی تشکیل

پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفار بخاری: ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ شعبہ اسلامی تاریخ نمل اسلام آباد

ان تجاویز پر عمل درآمد کیسے ممکن ہے اور ان میں اساتذہ کا کردار کیا ہے حکومت کا کردار کیا ہوسکتا ہے۔ بچوں کی تربیت گھر سے کیسے ہوسکتی ہے؟ ان سب امور پر آج کی مجلس میں غور ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن: اسسٹنٹ پروفیسر اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی آف انجینئرنگ لاہور

اگر آج کی محفل سے کوئی متفقہ اور اہم تجاویز سامنے آجائیں تو میرا خیال ہے کہ ہمارا مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔

ڈاکٹر محفوظ احمد: ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ، سکول آف عریبک اینڈ اسلامک اسٹڈیز یونیورسٹی آف فیصل آباد

جتنی اہمیت سماج کو حاصل ہے اتنی ہی ہم آہنگی کی ہے جتنی دین کی ہے اتنی ہی رواداری کی ہے۔

ڈاکٹر سید اظہار حیدر: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی یونیورسٹی آف فیصل آباد

پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ یہاں پر دانش وروں سے مسائل کے حل کیلئے رجوع ہی نہیں کیا جاتا۔ آپ نے ہمیں ایک بڑا پلیٹ فارم مہیا کیا ہے۔

ڈاکٹر آغا محمود احمد: اسسٹنٹ پروفیسر، فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ یونیورسٹی آف سرگودھا

ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہمارا مذہبی رواداری یا سماجی ہم آہنگی کا معیار کیا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے کوئی چیز سامنے آسکتی ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمن: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

سماجی ہم آہنگی کیلئے ہمیں جامعات اور مدارس کو قریب لانا ہوگا۔ ایک دوسرے سے رابطے بڑھانا ہوں گے۔

ڈاکٹر عبدالحسن شبیر: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

ہمیں دوسرے کی بات سننے کو اہمیت دینی چاہیے۔ زمینی حقائق کا اعتدال اور عدل کے ساتھ خیال رکھیں۔ جب ہم رواداری کی بات کرتے ہیں تو ہمیں دوسروں کے حقوق کی ادائیگی پر توجہ دینی چاہیے۔

ڈاکٹر اویس سرور: سربراہ شعبہ عربی گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ

میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سب سے پہلا فریضہ اساتذہ کا ہے اور بعد میں معاشرے کے دوسرے طبقات کا ہے مگر بدقسمتی سے ہم بطور استاد اس ذمہ داری سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔

حافظ شعیب فاروق: فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، یونیورسٹی آف واہ، واہ کینٹ

ذمہ داریاں اور حقوق ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اگر اپنے اپنے دائرے میں ذمہ

داریاں ادا کریں تو مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔

ڈاکٹر مفتی عبدالرزاق: لیکچرار شعبہ اسلامیات غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

ہمیں ان اسباب کا جائزہ لینا ہوگا جو عدم ہم آہنگی، عدم رواداری کا باعث بنتے ہیں جن کو دیکھتے ہوئے حل کیلئے تجاویز دی جاسکتی ہیں۔ قائداعظم تقریر کر رہے تھے کہ ایک بندہ کھڑا ہوگیا، مولانا شبیر احمد عثمانی بھی سٹیج پر موجود تھے۔ بندے نے پوچھا کہ آپ پاکستان میں کون سا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں تو قائداعظم نے جیب سے قرآن نکالا اور کہا کہ ہم قرآن کے نظام کو لانا چاہتے ہیں۔ آج میں یہی سمجھتا ہوں کہ متفقہ علیہ پر اتفاق ہونا چاہیے۔

آفتاب احمد: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

آج کی نشست میں ہمیں ایک دوسرے سے استفادے کا موقع ملے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہم آہنگی جو ہماری جامعات کے شعبہ جات میں ہونی چاہیے وہی مفقود ہے اور جب ان اساتذہ کے رویّوں کو ہمارے طلباء دیکھتے ہیں تو ان کے درمیان ہم آہنگی اور رواداری کی بجائے فرقہ واریت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ایسا نصاب اور ضابطہ ضرور ہونا چاہیے جس سے اساتذہ کے اندر بھی ہم آہنگی پیدا ہو۔ اس وقت سب سے زیادہ اہمیت انسانی آفاقی اقدار کی ہے اس کی بات قرآن بھی کرتا ہے کہ تکریم انسانیت کی بنیاد پر ایسا لائحہ عمل بنایا جائے۔ وہ لائحہ عمل جو مدینہ پاک میں بنایا گیا جہاں سب پیار، محبت اور رواداری کی بنیاد پر رہ رہے تھے۔

عبدالصمد ہارون شیخ: اسسٹنٹ پروفیسر دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

دعوۃ اکیڈمی میں مجھے 30 سال ہوگئے ہیں ہماری اکیڈمی بھی مختلف مسالک اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کیلئے کام کر رہی ہے۔ اصل میں سماجی و مذہبی رواداری کے فقدان کی سب سے بڑی وجہ جہالت ہے۔ ہم لوگ پڑھتے نہیں اور سنی سنائی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ مغرب میں ہم سے زیادہ مسالک اور مذاہب ہیں وہاں یہ مسئلہ کیوں نہیں ہے۔

جمیل اختر: لیکچرار شعبہ اسلامیات یونیورسٹی آف گجرات

یہ مضمون اہم ہونے کے ساتھ ساتھ حساس بھی ہے۔ ہماری یونیورسٹی بھی اس پر کام کر رہی ہے۔ عدم رواداری کی سب سے بڑی وجہ ہمارے علم اور روایات کی غلط توجیح بھی ہے۔

ڈاکٹر ارشد منیر: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان

میں ایک استاد ہوں، میں چاہتا ہوں کہ میری رائے کو ہی اہمیت دی جائے اور میرا کہا ہوا ہی حرفِ آخر ٹھہرے۔ میں اپنے ساتھیوں سے بھی حسد کرتا ہوں۔ میں نے دو تین بچوں کو صرف اس لئے فیل کیا کہ وہ دوسرے اساتذہ کو اہمیت دیتے ہیں مجھے نہیں دیتے۔ میں یہ چاہ رہا ہوں کہ ان دو دنوں میں، میں جب یہاں سے اٹھوں تو میں تبدیل ہو کر جاؤں۔

ڈاکٹر الطاف حسین لنگڑیال: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

جنہوں نے ہم آہنگی پیدا کرنی ہے ان کے درمیان خلیجیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ اگر اس طرف توجہ دی گئی ہے تو شاید آگے چل کر یہاں کوئی بہتر صورتحال ہو سکے۔ عام لوگوں میں شاید ہم آہنگی ہے بھی اور اگر وہ نہیں ہے تو رہنماؤں کے اندر نہیں ہے۔ معاشرہ آپ کے انتظار میں ہے اگر کسی جانب سے کوئی پیش رفت ہو تو معاشرہ قبول کرنے کو تیار ہے۔ ہمیں منفی پیغامات کو روکنا ہے۔ دنیا نے ہم سے اخلاقیات سیکھی ہیں اس لئے ہمیں خود احتسابی کرنا ہوگی۔

ڈاکٹر نگہت اکرم: کوآرڈینیٹر شعبہ اسلامیات پونچھ یونیورسٹی راولاکوٹ آزاد کشمیر

بچے استاد کے کردار سے بہت زیادہ اثر لیتے ہیں۔ اس لئے استاد کا کردار نہایت اہم ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت زیادہ فرسٹریشن پائی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں میں برداشت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ مذہبی تعلیم کی بنیادی واقفیت تمام شعبوں کے طالب علموں کو دی جائے۔

ڈاکٹر راحیلہ خالد: چیئر پرسن شعبہ عربی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

تعلیم و تربیت کیلئے دو ادارے اہم ہوتے ہیں۔ ایک ماں کی گود اور دوسرے سکول و کالج۔ آپ دیکھ رہے ہوں گے کہ اس وقت گھروں کے اندر بھی عدم برداشت کی کیفیت

ہے، وہاں بھی ہیجان ہے۔ مجموعی طور پر ہمارا معاشرہ اس کا شکار ہے۔ شاید ہم جس مادہ پرستی کی طرف چل پڑے ہیں یہ اس کا ثمر ہے، ہم سب کو اپنی اپنی اصلاح کرنی ہوگی۔ ابھی حال ہی میں حکومت نے سماجی ہم آہنگی و مذہبی رواداری کیلئے نصاب ترتیب دینے کی بات کی ہے۔

ڈاکٹر صدف سلطان: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی لاہور

اگر اس طرح کی ورکشاپس سے اساتذہ کو اس بات پر راغب کر لیا جائے تو یقیناً سماجی ہم آہنگی کیلئے بہت کام ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر فیروز کھگہ: پروفیسر فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورئینٹل لرننگ یونیورسٹی آف سرگودھا

اساتذہ کے انتخاب کے وقت اس کے کردار کو پیش نظر رکھا جائے اگر استاد اچھا ہوگا تو اچھی قوم پیدا ہوگی۔ اچھے استاد ہی اچھی قوم کی ضمانت ہو سکتے ہیں۔

رقیہ بانو: اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات ویمن یونیورسٹی ملتان

ہم اگر اپنی اپنی ذمہ داریاں بطور احسن سرانجام دیں تو معاشرے سے تمام سماجی برائیوں کا خاتمہ ممکن ہے۔

امِ کلثوم: اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی ویمن یونیورسٹی ملتان

اسلام تو نام ہی برداشت اور رواداری کا ہے۔ اب بحیثیت استاد ہمیں اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

تیسری نشست: گروپ رپورٹس اور ان پر بحث

صدارت: مولانا راغب نعیمی (پرنسپل جامعہ نعیمیہ لاہور)

گروپ اے

پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفار بخاری:

یہاں ایک ہی ملک میں کئی طرح کے نظام ہائے تعلیم چل رہے ہیں جن کے اپنے اپنے نصاب ہیں۔اس طرح کیسے ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے جب ہر ایک کی سمت ہی مختلف ہو، پرائیویٹ ادارے، سرکاری ادارے اور مدارس الگ الگ سمت چل رہے ہیں۔اس لئے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ تمام صوبوں میں اور اداروں میں یکساں نصاب ہو۔نصاب سازی کرتے وقت اختلافی امور سے اجتناب کیا جائے۔پچھلے دنوں ایک کتاب آئی۔جس میں ڈارون کی تھیوری میں اسلام کے خلاف حملے کئے گئے تھے جس پر ہائیر ایجوکیشن کمیشن کو شکایت کی گئی۔ہم نے اس پر لکھ کر دیا کہ یہ چیزیں نکالی جائیں۔

ایک اور بات اہم یہ ہے کہ جب کسی کو کوئی اور نوکری نہیں ملتی تو وہ استاد بن جاتا ہے۔اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی پالیسیاں بنائی جائیں جن کے تحت درسگاہوں کو اہل اساتذہ میسر آئیں جو قوم کی فکری رہنمائی کرنے کے اہل ہوں پھر ایسے اساتذہ کی تعلیم وتربیت کا بھی انتظام کیا جائے۔ہمارے معاشرے میں استاد کو عزت بھی نہیں دی جاتی۔

اساتذہ کو کلاس میں صرف نصاب تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ ہمیں جو سماجی چیلنجز درپیش ہیں ان کے مطابق طالب علموں کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ارباب مدارس کو نظر انداز کیا جارہا ہے اور ان پر الزام تراشی کی بجائے انہیں مختلف امور میں شامل کیا جائے۔اس طرح مدارس کے نصاب میں مذہبی وسماجی ہم آہنگی کیلئے کام کیا جائے۔مدارس کے طلباء کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ دیا جائے۔

میڈیا پر دین کو ایسے لوگوں کے سپرد کر دیا گیا ہے جنہیں اس کا پتہ ہی نہیں ہے لہٰذا اس سلسلے میں بھی باقاعدہ کوئی طریقہ کار وضع کیا جائے اور پروگراموں میں یونیورسٹی لیول کے اساتذہ کو مدعو کیا جائے۔

عوام میں علمائے حق اور علمائے سو کے تصور کو اجاگر کرنا۔

ڈاکٹر راغب نعیمی:

اگر کوئی ان تجاویز پر رائے دینا چاہے تو اجازت ہے۔

رائے: نصاب سازی میں اساتذہ کو شامل تو کیا جاتا ہے مگر جو گائیڈ لائن دی جاتی ہیں اسی کے اندر رہنا ہوتا ہے۔اٹھارویں ترمیم کے بعد نصاب سازی میں صوبوں کا کردار ہے۔پنجاب میں نصاب سازی کا ادارہ موجود ہے جو کہ مختلف مضامین کی کتابیں مرتب کرتا ہے۔وہ نصاب سازی کیلئے مختلف اداروں کے لوگوں کو بلاتے ہیں مگر دیکھا گیا ہے کہ اساتذہ وہاں جا کر بیٹھنے سے گھبراتے ہیں۔

رائے: اگر ان میں سکولوں، کالجوں، مدارس اور یونیورسٹی سب اساتذہ کو بلایا جائے تو بہتر نتائج نکل سکتے ہیں۔

قدسیہ خاکوانی:

نصاب سازی میں شامل اساتذہ کیلئے کچھ نہ کچھ قواعد وضوابط ہونے چاہئیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ نصاب سازی میں کس درجے کے اساتذہ شامل ہوسکتے ہیں۔

ڈاکٹر راغب نعیمی:

اب اس میں تھوڑی وسعت پیدا کی گئی ہے۔نصاب سازی کیلئے پہلے گائیڈ لائنز دی جاتی ہیں۔ایک بندہ یا کوئی گروپ اپنی کتاب مرتب کرتا ہے۔اس طرح کئی کتابیں بورڈ میں پیش ہوتی ہیں۔بورڈ فیصلہ کرتا ہے کہ کون سی کتاب بورڈ کے معیار پر پورا اترتی ہے۔یہاں پر دو طرح کی کتابیں مرتب ہوتی ہیں جیسے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی ایک باقاعدہ کتاب ہے جسے وہ خود شائع کراتا ہے۔دوسرا یہ کہ کوئی بھی مرتب اپنی جانب سے بھی کتاب شائع کرسکتا ہے۔جس کو پبلشر شائع کر کے فروخت کرتا ہے۔اگر ہم ان نکات کی بات کریں جو نصاب میں جگہ بنا نہیں پاتے تو کسی اور طریقے سے آپ اپنی کتاب لکھ کر بھی اس کمی کو پورا کرسکتے ہیں لیکن یہ بات درست ہے کہ نصاب مرتب کرتے وقت ماہر اساتذہ کو ہی اس میں شامل کیا جائے۔

رائے:

ایک کونسل بنائی جائے جو نصاب کی منظوری دے۔جو نصاب ٹیکسٹ بک بورڈ مرتب

کریں انہیں حتمی منظوری کیلئے نصاب کونسل کو بھیجا جائے جو اس میں ترمیم و اضافہ کرنے کی مجاز ہو۔

ڈاکٹر فیروز کھگہ

اگر ایم اے یا ایم فل کے لیول پر بھی کوئی مخصوص نصاب ہوگا تو اس سے آپ طلباء کی سوچ اور فہم و فراست کو محدود کر دیں گے اس میں اساتذہ کو جو چیلنج در پیش ہیں ان پر توجہ دی جائے۔

ڈاکٹر راغب نعیمی:

جہاں سے نصاب کی گائیڈ لائن آ رہی ہیں وہاں تک بھی ہمیں اپنی آواز پہنچانی ہوگی۔

ڈاکٹر حسن الامین

ہم آہنگی کی ضرورت تو معاشرے کے تمام طبقات میں ہے۔اس حوالے سے دانشوروں اور علماء کا کیا کردار ہو سکتا ہے اس حوالے سے بھی بات کی جائے۔

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن:

مذہبی عدم رواداری کی بنیاد پر جتنے افراد ہر سال ہلاک ہو رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ سیاسی عدم رواداری کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔اس لئے ہم صرف مذہب کو ہی کیوں فوکس کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر شہباز منج:

مذہبی رواداری اس لئے زیادہ ضروری ہے کیونکہ انسان سیاست کے مقابلے پر مذہب کے معاملے میں زیادہ شدت پسند ہوتا ہے۔اس لئے مذہبی رواداری، سیاسی رواداری سے زیادہ اہم ہے۔

سوالات:

ڈاکٹر محفوظ احمد:

اساتذہ کی تعیناتی کرتے وقت مذہبی رواداری کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔بہت سارے سلیکشن بورڈز پر ایک ہی مسلک کی چھاپ ہے اس لئے وہ اس مسلک کے لوگوں کو بھرتی کرتے ہیں۔اس لئے کوئی ایسی پالیسی ہونی چاہیے کہ سلیکشن بورڈ پر کسی ایک مسلک یا مذہب کی چھاپ نہ ہو۔

گروپ بی کی رپورٹ

ڈاکٹر طاہر محمود:

ہم نے پانچ مسائل کی نشاندہی کی ہے اور پھر پانچ تجاویز دی گئی ہیں۔

مذہبی رواداری کے فقدان اور سماجی ہم آہنگی کے نہ ہونے سے ہمارے معاشرے میں مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان میں سرفہرست یہ ہیں۔

1- فرقہ واریت، مسلکی تعصب، مذہبی و لسانی منافرت۔

ہر روز معاشرتی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اثرات عائلی زندگی پر بھی مرتب ہو رہے ہیں جہاں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے شادی کا مقدس رشتہ بھی طلاق پر منتج ہوتا ہے۔

2- طبقاتی نظام تعلیم اور اس کا فروغ، یہ مسئلہ قومی نوعیت کا ہے جو ہمارے کئی سماجی معاشرتی مسائل کی جڑ ہے جہاں ملا اور مسٹر کی تفریق ہو رہی ہے۔امت واحدہ کو منتشر کیا جا رہا ہے اس لئے یکساں نصاب تعلیم کی ضرورت ہے۔

3- معاشرے کے اہم عناصر والدین، اساتذہ، مقتدر طبقات، میڈیا، ان کی اصلاح احوال میں عدم دلچسپی ہے۔یہ لوگ تربیت میں فعال کردار ادا کر سکتے ہیں لیکن ہر کوئی اپنے اپنے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔اس لئے معاشرے کے ان اہم طبقات کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا ہوگا۔ماں سے لے کر ریاست تک ہر ذمہ دار شخص کو فعال ہونا ہوگا۔

4- عدل اجتماعی کا فقدان: اس وقت ہم من حیث القوم سماجی انصاف کی عدم موجودگی کا شکار ہیں۔مسلکی تعصب کو ظلم و زیادتی کیلئے استعمال کرنا حرام ہے۔اگر ایک شخص کے ساتھ

محض مسلک کی وجہ سے زیادتی کی جارہی ہے تو یہ بددیانتی اور خیانت ہے۔افراط وتفریق سے ہمیں پاک ہونا پڑے گا۔قومی جامعات کسی خاص مسلک کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ہیں۔ان میں تعیناتی کرتے وقت ہر قسم کے تعصّبات کو بالائے طاق رکھا جائے۔

5- جدید عصری تعلیمی اداروں میں فکری وتہذیبی تضاد

جدید تعلیمی ادارے جہاں سے ہماری لیڈر شپ آتی ہے۔ان پر ہماری توجہ بالکل نہیں۔ہمیں کہا جاتا ہے کہ مدارس میں کمپیوٹرز رکھو،کبھی ان سے پوچھا گیا کہ بچہ تمہارے پاس پورا سال رہتا ہے اس کو نماز آتی ہے،قرآن وسیرت کا علم ہے۔اس لئے ہمیں اس پر توجہ دینی ہوگی۔

تجاویز:

1- قومی تعلیمی نصاب میں یکسانیت

قومی جامعات اور دینی مدارس کے درمیان خلا کو پُر کیا جائے۔ایک دوسرے کے طلباء اور اساتذہ سے استفادہ کیا جائے۔

2- اعلیٰ انسانی مشترکہ اقدار کا تعین اور ان کا فروغ

یعنی مذہبی وسیاسی منافرت کوئی بھی ہو اس کے خاتمہ کیلئے اعلیٰ انسانی اقدار جو تمام مسالک و مذاہب میں مشترکہ ہیں اور ان کے درمیان کوئی مذہبی اختلاف نہیں انہیں فروغ دیا جائے۔حقوق کا مطالبہ کرنے سے پہلے اگر حقوق کی ادائیگی شروع ہوجائے تو معاشرے میں تبدیلی آجائے گی۔اب ہر کوئی حق مانگتا ہے لیکن دیتا نہیں ہے۔

3- مسلم معتقدات وشخصیات کا احترام

ہمیں بین الاقوامی سطح پر یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں تحمل و برداشت نہیں حالانکہ مسلمانوں کے عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ جب تک ہم حضرت عیسیٰ،حضرت موسیٰ پر ایمان نہ لائیں ہمارا ایمان مکمل نہیں ہوتا تو وہ لوگ جو ہمیں طعنہ دیتے ہیں اور ہمیں موردِ الزام ٹھہراتے ہیں جو ہمارے نبی کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔آئے روز توہین

رسالت کے واقعات کیوں ہوتے ہیں کبھی کسی مسلمان نے بھی حضرت عیسیٰ کی شان میں گستاخی کی۔اس طرف بھی توجہ دی جائے۔

4- انتہاپسندانہ افکار ونظریات کا خاتمہ

جس طرح دینی مذہبی طبقات کو کہا جاتا ہے کہ انتہاپسندی سے بچو،مگر دوسری جانب جو سیکولر طبقات ہیں وہ مذہبی طبقات کے جذبات مجروح کرتے ہیں وہ بھی اپنے احساسات میں انتہاپسند واقع ہوتے ہیں۔اس لئے سب اپنے افکار ونظریات میں توازن پیدا کریں۔

5- مختلف مکاتب فکر کا باہمی تعاون

مختلف مکاتب فکر صرف ہوٹلوں اور سیمیناروں اور میں اکٹھے نہ ہوں بلکہ مساجد اور مدارس میں بھی ہوں۔ایک دوسرے کے مسالک کے لوگ ایک دوسرے سے ملیں اور بیٹھیں۔حیرت ہے کہ یہ لوگ کاروبار کرتے وقت ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں مگر مذہب کے معاملے میں الگ الگ ہوجاتے ہیں۔اس لئے باہمی رابطوں کو بڑھایا جائے۔

سوالات وآراء:

اس پس منظر میں معلم کا کردار کیا ہے اس کو دیکھنے کی ضرورت ہے جب معاشرہ طبقاتی کشمکش کا شکار ہوتا ہے تو لوگ مذہب کا سہارا لیتے ہیں اس لئے طبقاتی تقسیم کو ختم کیا جائے۔

ڈاکٹر راغب نعیمی:

ماضی میں آداب واخلاق کے حوالے سے بڑا کام ہوا ہے۔پنجاب میں مذہبی یا غیر مذہبی لٹریچر میں پاکستان کی سالمیت کے خلاف اگر کوئی بات کی جائے گی تو وہ قانون کی زد میں ہوگی اسی طرح یہ طے کیا جارہا ہے کہ کسی بھی کتاب کی اشاعت سے پہلے پبلشر اور مصنف اس بات کا اہتمام کرے گا کہ اس کتاب میں کوئی بھی ایسا مواد نہیں ہے جو کہ اس ضابطہ اخلاق سے متصادم ہو۔اگر ایسا ہو تو اس سے متعلق آنے والے دنوں میں قانون سازی ہونے والی ہے لیکن ہم بحیثیت استاد کیا کرسکتے ہیں ہمیں یہ دیکھنا ہے۔

گروپ سی کی رپورٹ

ڈاکٹر الطاف حسین لنگڑیال:

-1 بین المسالک، بین المذاہب عدم رواداری اس وقت بڑا مسئلہ ہے۔اس کے ذمہ دار ہم ہیں۔

-2 سماجی ہم آہنگی کا مذہب سے تعلق ہے بھی اور نہیں بھی۔معاشی عدم مساوات اس کا باعث ہے۔جس کے بعد معاشرتی عدم مساوات پیدا ہوتی ہے۔امیر اور غریب میں اتنا فرق دنیا میں شاید ہی اور کہیں ہو۔عدم برداشت کی ایک بڑی وجہ میڈیا بھی ہے۔میڈیا نے قوم کو بخار میں مبتلا کر رکھا ہے ایسا لگتا ہے کہ ایک زلزلہ آنے والا ہے انہوں نے قوم کو نشے میں مبتلا کر دیا ہے۔میڈیا نے قوم کو اور تقسیم کر دیا ہے۔اساتذہ مسالک اور پروموشن کی بنیاد پر آپس میں دست و گریبان ہیں۔یہ قوم کو کیا راہ دکھائیں گے جو اپنی راہ بھول گئے ہیں۔اس طرح اساتذہ کے کردار کو کم کیا جا رہا ہے۔حکومتیں اور میڈیا اس میں شامل ہیں۔مادی سوچ اس کی بڑی وجہ ہے استاد کو ایک انسٹرکٹر بنا کر رکھ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا وقار معاشرے میں مجروح ہوا ہے۔

تجاویز:

-1 بین المذاہب و مسالک ہم آہنگی پیدا کی جائے۔مذہبی پیشوا و راساتذہ اس کیلئے موثر کردار ادا کریں۔

-2 طلباء کے مابین باہمی منافرتوں کو دور کیا جائے۔

-3 بہاولپور میں تمام مکاتب فکر کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ہم مدارس کے طلباء کو مدعو کرتے ہیں۔مکالمہ کراتے ہیں، مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کو یونیورسٹیوں میں داخلے دیئے جائیں۔

-4 بین المسالک، بین المذاہب کمیٹیاں بنائی جائیں، آپس کی دوریاں ختم ہوں، ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھیں گے تو قدورتیں ختم ہوں گی۔

-5 معاشی و معاشرتی عدم مساوات میں کمی کیلئے اساتذہ فکری محاذ سنبھالیں، سماجی ہم آہنگی و مذہبی رواداری کیلئے فضا ہموار کی جائے۔

معاشرے میں عدم برداشت کے خاتمے کیلئے تمام شعبہ ہائے زندگی اور بالخصوص میڈیا موثر کردار ادا کرے۔

-6 سماج کو متاثر کرنے کی سب سے زیادہ اہلیت خواتین رکھتی ہیں۔وہ اولاد کو جس راستے پر چلانا چاہیں چلا سکتی ہیں۔ہمارے ہاں مسلکی تعصب کی بڑی وجہ مائیں ہیں۔باپ خاصا لبرل ہے۔مگر گھر میں ماں رجعت پسند ہے۔ان خواتین پر فوکس کیا جائے۔خواتین اساتذہ کی الگ الگ ورکشاپس منعقد کی جائیں۔

-7 تمام شعبہ کے اساتذہ اپنے مسلکی و مذہبی اختلافات کو ایک جانب رکھتے ہوئے طلباء میں ہم آہنگی پیدا کریں۔

رائے:

یہاں خواتین پر ذمہ داری ڈال دی گئی ہے حالانکہ خواتین کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ باپ اور بچہ کس مسجد میں جا کر نماز پڑھتے ہیں۔اس طرح اگر باپ مسجد نہ جائے تو بچہ کہتا ہے کہ میں کیوں جاؤں۔

ڈاکٹر راغب نعیمی:

آج جو باتیں اس نشست میں سامنے آئیں ان کے مطابق اساتذہ کو نصاب سازی میں شریک کیا جائے۔دوسری بات یہ سامنے آئی کہ اساتذہ کی تربیت کا مسلسل اہتمام کیا جائے۔سوشل میڈیا پر رواداری کی بڑی ضرورت ہے۔اس شعبے میں خصوصی کام کیا جائے۔اس طرح الیکٹرانک میڈیا مذہبی تہواروں کے موقع پر کچھ مسالک کی رائے کو بہت زیادہ پروموٹ کرتا ہے۔مدارس اور جامعات کے درمیان رابطے بڑھائے جائیں اور دونوں تعلیمی ادارے مل کر پروگرام کریں۔

چوتھی نشست

صدارت: ڈاکٹر قبلہ ایاز

مقررین: ڈاکٹر خالد مسعود، خورشید ندیم

عنوان: پاکستان کا سماجی وسیاسی منظر نامہ اوراعلیٰ تعلیمی اداروں کا کردار

مقرر: ڈاکٹر خالد مسعود

آج کی نشست سے جونکات سامنے آئے اس کو دیکھیں تو لگتا یہ ہے کہ رواداری پر ہمارا اتفاق نہیں ہے۔ سیاسی وسماجی منظر نامے کے دو پہلو بنتے ہیں ایک نظری اور دوسرا عملی۔ ہم جب عام طور پر بات کرتے ہیں تو زیادہ بحث نظری پہلو پر ہوتی ہے۔

عملی پہلو پر ہماری معلومات بھی کم ہیں، تحقیقات بھی کم ہیں۔ اس میں ہمارا زیادہ تر ماخذ اخبارات ہیں۔ عامر رانا صاحب جیسے لوگوں کی اس پر تحقیق ہے وہ اس کے پس منظر اور پیش منظر سے آگاہ ہیں۔

اس کے مطالعے سے جو پہلی چیز سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اس میں اختلاف ہے، تنوع ہے اور مختلف لوگوں کے نکتہ ہائے نظر ہیں۔ وہ اختلاف کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ اس کی وجہ سے ہم یکسانیت اور اتحاد کی بات کرتے ہیں لیکن اس پر بات کرتے ہوئے ہم اختلاف اور تنوع کو ختم کرنے کی بات کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی روایت میں اختلاف اور تنوع کی اہمیت بہت زیادہ ہے بلکہ میرے خیال میں اللہ تعالیٰ نے اختلاف اور تنوع کو اپنی آیات میں بیان کیا ہے اور ہماری پوری اسلامی، علمی، تاریخی اور سیاسی روایت اس اختلاف کے حق میں اس کی حفاظت کیلئے بلکہ تقلید اس اختلاف کو تحفظ دینے کیلئے ہے۔ تقلید اختلاف کو ختم نہیں کرتی بلکہ محفوظ کرتی ہے تاکہ زیادہ بہتر طریقے سے ہم اس اختلاف کو استعمال کرسکیں بجائے اس کے ہم اپنی توانائیاں آپس میں لڑکر ضائع کریں ہم اپنے اپنے دائرے میں اس اختلاف اور تنوع سے طاقت حاصل کریں۔ پاکستان کے سلسلے میں بات یہاں سے شروع کروں گا کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہاں تنوع اور اختلاف بہت زیادہ ہے خاص طور پر سماجی اور سیاسی نقطہ سے، ہونا تو یہ

چاہیے تھا کہ ہم اسے اپنی طاقت بناتے کیونکہ تنوع آپ کی فکر کو وسعت دیتا ہے آپ کے تصورِ کائنات کو وسیع کرتا ہے۔ آپ کے تجربات کو وسیع کرتا ہے۔ آپ کو ہمت دیتا ہے کہ ان اختلافات میں آپ اپنی راہ کیسے نکالیں لیکن یہ سب چیزیں اس وقت ہوسکتی ہیں جب ہم اس کے سیاسی و سماجی پس منظر سے صحیح طریقے سے واقف ہوں۔ ہمارا عام طور پر اس کے بارے میں علمی رویہ نظری زیادہ رہا علمی کم رہا۔ میں اس کی وضاحت کردوں کہ جب عباسی سلطنت خلیفہ منصور کے زمانے میں تشکیل پارہی تھی اس کے سیکرٹری امین نے ایک رسالہ خلیفہ منصور کیلئے رسالۃ الصحابہ کے نام سے لکھا۔ اس میں اس نے اس وقت کے قبائل جو افواج میں موجود تھے ان کی عادات، ان کی کمزوریوں، ان کی اچھائیوں سب کا تجزیہ پیش کیا اور اس کے بارے میں خلیفہ کو مشورہ دیا کہ اگر آپ اس اختلاف میں اپنا حصہ ڈال سکیں اور ان سب کو اتفاق پر لاسکیں تو یہ بہت بہتر ہوگا۔ اختلافات جو خاص طور پر مذہبی اور فقہی ہیں ان میں خلیفہ اپنی رائے دے کر ایک سمت کا تعین کرسکتا ہے۔ اس اختیار کو آپ استعمال کریں۔ خلیفہ منصور نے اس وقت مدینہ میں امام مالکؒ کے پاس خلیفہ تشریف لے گئے اور بات کی۔ امام مالکؒ نے فوراً کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ میری جو آراء ہیں وہ مذہبی ہیں وہ خاص اجماع اور سوچ پر مبنی ہیں وہ صحابہ کرام جو دوسرے علاقوں میں گئے ہیں ان کی رائے مختلف ہے۔ تو انہوں نے منع کیا کہ اس اختلاف کو ختم نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہی اختلاف ایک قوت ہے۔ اس طرح کی چند اور مثالیں بھی ہیں۔ البیرونی، ہندوستان آیا اس نے یہاں کے حالات کا، یہاں کے قبائل کا مطالعہ کیا اور پوری کتاب لکھی جس کے تراجم بھی ہو چکے ہیں بعد میں جب خاندانِ غلاماں کے اور ترک بادشاہ یہاں آئے تو اس کی ان تحقیقات سے فائدہ اٹھایا۔ اس علاقے میں اس نے بدھ مت اور ہندومت کے ماہرین سے سنسکرت سیکھی اور ان کے مذاہب کا مطالعہ کیا ورنہ اس کیلئے آسان تھا وہ یہ لکھتا کہ یہ سب لوگ بت پرست ہیں مگر وہ ان کی تہہ میں گیا۔

اس طرح جب برطانیہ کی کالونیل حکومت یہاں شروع ہوئی تو ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے یہاں کے سماجی حالات کا مطالعہ کیا، یہاں کون کون سے قبائل ہیں۔ یہاں کی معاشیات اور سیاسیات کیا ہے۔ اس پر انہوں نے ہر ضلع کا الگ گزٹ مرتب

کیا۔ پاکستان بنا تو ہم نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ زیادہ سے زیادہ 1970ء میں ہم نے وہ گزٹ دوبارہ چھاپ دیئے جو سترویں اور اٹھارویں صدی کے ہیں اس کے بعد حالانکہ سماجی و سیاسی پس منظر میں بہت ساری تبدیلیاں آئیں لیکن اس کا ہم نے کوئی مطالعہ نہیں کیا اب بھی بہت کم مطالعہ پاکستان کی سماجی ساخت پر موجود ہے۔ ہمارے ہاں انتھروپالوجی اور سوشیالوجی کے ڈیپارٹمنٹ بھی موجود ہیں اس طرح کے مطالعے باہر کے محققین کے ہیں جو باہر سے آکر یہاں کے سماجی پس منظر میں مطالعے کرتے ہیں۔

پاکستان جب بنا تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ بہت سارے مسائل کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسلم لیگ کا کام ان علاقوں میں نہیں تھا جہاں پاکستان بنا جن علاقوں میں مسلم لیگ کی تحریک یا نظریے کی بات ہوئی وہ ہندوستان کا حصہ ہیں۔ پنجاب، شمالی صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ ان کی اپنی اپنی ثقافتیں ہیں اور ایک تنوع ہے۔ ان کی اپنی اپنی سیاسی تشکیل تھی چونکہ یہاں نظریہ پاکستان کی تحریک نہیں تھی یہاں دوسری تحریکیں بھی تھیں جو نظریہ پاکستان کی مخالف تھیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم پاکستان بننے کے فوراً بعد یہاں کے معاشی، سیاسی، سماجی حالات کا تجزیہ کرتے وہ تجزیہ نہیں ہو پایا۔

لوگوں کو ایک اکائی بنانے کیلئے کہ ہم ان کے مفادات کو دیکھتے ان کے علاقے کی ضرورتوں کو دیکھتے اور اس کے مطابق انھیں پاکستان کی سیاست، معیشت اور پاکستان کی قومیت سے وابستہ کرتے تاکہ اس میں ان کا حصہ ہوتا وہ ہم نہیں کر پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہم آئین سازی کی کوشش کر رہے تھے تو یہ ساری باتیں لڑائی یا تضاد کے طور پر نہیں مطالبات کے طور پر آئین ساز اسمبلی میں آئیں لیکن اس سے ہماری اس وقت کی قیادت خوف زدہ ہوگئی اور انہوں نے اس کا شارٹ کٹ ڈھونڈا۔ وہ یہ تھا کہ پاکستان کی قومیت کی تاریخ جو اس وقت بھی ابہام کا شکار تھی جب قیام پاکستان کی تحریک چل رہی تھی ہم نے اس کو مسلم قومیت کا نام تو دیا مگر مسلم قومیت کی تاریخ کیا ہوگی اس کے لوازمات کیا ہوں گے۔ مسلم قومیت کیسے آگے بڑھے گی اس پر بات نہیں ہو پائی تھی جو بات بھی تھی اس کا زیادہ تر حوالہ یہ تھا کہ فقہی طور پر قومیت کا مطلب کیا ہے۔ کالونیل دور میں مثلاً ایک بحث یہ ہوئی کہ جب یہاں جدید ریاست آئی کیونکہ اس سے پہلے تو یہاں پر بادشاہت

تھی۔ چنانچہ جدید ریاست میں بادشاہ کا صوبوں پر کنٹرول نہیں ہوتا تھا ہماری عدالتوں کا انتظامیہ کا پورا فوکس شہروں پر تھا، دیہات اس فوکس سے باہر تھے۔ قاضی بھی شہروں میں ہوتے تھے۔ دیہاتوں میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد تھی اور یہ نمبردار کے ماتحت تھے جو زیادہ تر ہندو تھے۔ یہاں فیصلے مقامی روایات کے تحت ہوتے تھے۔ جب ریاست آئی تو اس نے ٹیکسوں میں تعلیم میں اور دیگر معاملات میں دخل دیا اور ہمہ گیر کنٹرول حاصل کیا۔ اس جدید ریاست میں ہمارے ہاں بحث یہ تھی کہ انگریزوں کے آنے کے بعد ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالسلام ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے فتوؤں کا بہت ذکر ہوتا ہے۔ ایک فتویٰ تھا جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ یہ دارالحرب بن گیا ہے۔ سات یا آٹھ فتوے اور بھی ہیں۔ اس پوری تاریخ کا ایک بیانیہ ہم نے کالونیل دور میں بنایا وہ تاریخ نہیں ہے بیانیہ ہے جس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ہم نے قومیت کی تحریک میں انیسویں صدی میں آزادی کیلئے استعمار کے خلاف ایک بیانیہ بنایا اور اس بیانیہ میں شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ استعمال ہوا کہ انہوں نے سب سے پہلے اسے دارالحرب قرار دے کر ہمیں آزادی کیلئے منشور دیا۔ شاہ عبدالعزیز کے دارالحرب کے متعلق جتنے بھی فتوے ہیں وہ ان کی طرف سے نہیں بلکہ ان سوالات کے جوابات ہیں جو لوگوں نے پوچھے ہیں ان سوالات میں کسی بھی جگہ نہ تو آزادی کا ذکر ہے نہ نئی ریاست بننے کا ذکر ہے۔

سوالات کیا ہیں؟

☆ اب یہ دارالحرب بن چکا ہے کیا وہاں سود کا لینا دینا جائز ہے؟

☆ اب یہ دارالحرب بن چکا ہے، کیا یہاں پر غلامی جائز ہے کہ ان کو خرید کر غلام بنایا جاسکتا ہے؟

☆ کیا انگریز کی نوکری کرنا جائز ہے؟

☆ کیا انگریزوں کا لباس پہننا جائز ہے؟

نہ کسی نے پوچھا کہ یہاں سے ہجرت کرنا فرض ہے نہ کسی نے یہ پوچھا کہ جہاد کرنا فرض ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے ان تمام سوالات پر بحث کی لیکن ان کے ہاں بھی یہ بات نہیں ملتی کہ اب جہاد فرض ہو گیا ہے یا ہجرت فرض ہوگئی ہے۔ جہاد اور ہجرت کی بات اس وقت ہوئی جب 1920ء

میں تحریک چلی اور اس میں پہلی بار ہمیں حقیقت کا سامنا ہوا کہ اس دوران مولانا آزاد اور بہت سارے دوسرے لوگوں نے فتوے دیئے۔ بہت سارے لوگ اس ہجرت میں شامل ہوئے انہوں نے اونے پونے اپنی جائیدادیں بیچیں اور افغانستان ہجرت کی۔ اس میں فائدہ دو کو ہوا۔ جتنے ہندو تھے انہوں نے اونے پونے وہ جائیدادیں خریدیں یہ لوگ جو ہجرت کے لئے گئے اکثر تو افغانستان نہیں پہنچ سکے۔ راستے میں ہی مشکلات پیش آئیں۔ افغانستان میں پہنچے تو انہوں نے ان کو واپس بھگا دیا۔ یہ پوری تحریک ناکام ہوئی لیکن ہمارا بیانیہ بالکل مختلف ہے۔ اور اس کی ناکامی اس بنیاد پر ہے کہ ہمارے فقہا نے بھی کوئی غلط مشورے نہیں دیئے۔ لیکن ہماری سوچ نظری تھی۔ فقہ میں بھی دارالحرب یا دارالسلام کی بحث جو ساتویں سے نویں صدی تک تھی وہ ہمارے سامنے تھی۔ لیکن اس میں بارھویں یا تیرھویں صدی میں بہت ساری تبدیلیاں آئیں۔ دارالامان، دارالحرب وہ ہمارے اس علم میں نہیں تھیں۔ دوسری بحث یہ تھی کہ ان کے ساتھ تعلق جائز ہے کہ ان کی نوکری کریں یا نہیں۔ ایک دوسری بحث تھی تشبہ بالکفار، یعنی کفار کا لباس پہننا، ان سے ملنا جلنا، اکثر آپ کو ایسے واقعات ملیں گے کہ ان سے ملنے کے بعد وہ فوراً اپنے ہاتھ دھوتے تھے کہ نجس لوگوں سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ اس زمانے میں انیسوی صدی کے اوائل میں دو نقطہ ہائے نظر آئے۔ ایک سرسید کا تھا ایک جمال الدین افغانی کا تھا۔ سرسید نے کہا کہ اس بات کو مان لیں کہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر شکست ہوئی ہے۔ اب اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ ہم اپنے سیاسی اقتدار کیلئے کوشش کریں جو اس وقت ناممکن نظر آتا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ ہم علمی طور پر اپنے آپ کو مضبوط کریں کہ جس علم اور ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر انگریزوں نے یورپ کی قوموں نے ان علاقوں پر قبضے کئے ہیں وہ قوت ہم اپنے میں پیدا کریں لیکن ہم نے سرسید کی کوششوں کو اس لئے رد کر دیا کہ وہ استعمار کو مانتی تھیں اور استعمار کو مضبوط کرتی تھیں اور یہ کہتی تھیں کہ ہم سیاسی طور پر کچھ نہیں کر سکتے۔ افغانی ہمارا ہیرو ہو گیا۔ افغانی کا کہنا یہ تھا کہ مسلمانوں سے اقتدار چھینا گیا ہے اب اس کا حل یہی ہے کہ ہم دوبارہ اقتدار حاصل کریں۔ چنانچہ انہوں نے جو راہ دکھائی وہ یہ تھی کہ استعمار سے ہر قسم کا رشتہ توڑ لیں۔ نئی تعلیم کے دھوکے میں نہ آئیں اور جتنا بھی ہو سکے ہم اس سے الگ ہوتے جائیں۔ جمال الدین افغانی نے سرسید کے بارے میں جو فتویٰ دیا

اس میں یہ کہا کہ سرسید نے اپنا مذہب ترک کر دیا ہے یہ صلیب پہنتا ہے انگریزوں کا لباس پہنتا ہے اور تمام انبیاء کو کہتا ہے کہ وہ فطرت کی پرستش کرتے تھے۔ اگر اس نے صحیح طور پر مطالعہ کر کے یہ فتویٰ لکھا ہوتا تو یہ باتیں نہ کہتا۔ وہ حیدرآباد میں قید تھا۔ حیدرآباد میں اس کی جتنے بھی علماء سے ملاقات ہوئی ان سب نے یہ باتیں بتائیں کہ سرسید تو عیسائی ہو گیا ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بیانیے میں ہم نے حقائق کو نہیں دیکھا بلکہ سیاسی و نظری طور پر جو چیز بھی فائدے میں لگیں اور ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکتی تھی ہم نے کیں۔ بہر حال یہ قومی ریاست اور خاص طور پر مسلم قومیت کیلئے اس چیز کی ضرورت تھی کہ ہم اپنی سماجی ساخت کو پنجاب کے، سندھ کے حالات کو دیکھتے اور ان پر اعتماد کرتے کہ ان کا مستقبل اب پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ کوشش نہیں ہوئی بلکہ ہم نے کئی ریاستوں کا پاکستان کے ساتھ زبردستی الحاق کیا اور اس سے جو مسائل پیدا ہوئے وہ آج تک ہم بھگت رہے ہیں۔ دوسرا ہم نے یہ سوچا کہ پاکستان میں وحدت قائم کرنے کیلئے دو چیزیں اہم ہو سکتی ہیں ایک زبان اور دوسرا اسلام۔ زبان کا مسئلہ یہ ہے کہ اردو زبان لنگا فرانکا تو تھی لیکن ایسی نہیں تھی کہ لوگ اسے مادری زبان کے طور پر استعمال کریں لیکن ہمارے ہاں زبانوں کی تدریس ادب کے طور پر آئی۔ ہم نے لٹریچر پڑھایا۔ ہم نے زبان کی استعمال کی چیزیں نہیں پڑھائیں چنانچہ میرا اپنا بھی یہ حال ہے کہ زبانیں میں نے پڑھیں لیکن نہ بول سکتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں لیکن زبان جانتا ہوں، کتابیں پڑھ سکتا ہوں۔ ہمارے ہاں بھی بی اے تک لوگ انگریزی پڑھتے ہیں، شاذ و نادر ہی لوگوں کو زبان آتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے ہم گرائمر سکھاتے ہیں۔ زبان سکھانے کیلئے یہ طریقہ نہیں ہے ہماری چونکہ اپروچ فطری ہے سماجی نہیں ہے۔ زبان سوشل کنسٹرکشن ہے یہ سوسائٹی اور سماج کی پیدا کردہ ہے۔ اسلامی روایات میں زبان کو توقیفی کہا گیا جو علمِ کلام کی اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے مزید بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ یعنی ہر لفظ کے معانی اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں وہ چونکہ ہمارے علم الکلام کی ضرورت تھی جب ہم وحی سے استدلال کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ بھی وحی کے برابر ہونا چاہیے تا کہ وہ معصوم بن الخطاء ہو سکے، تو ہم نے زبان کا سماجی پس منظر نہیں لیا اسی طرح باقی علوم میں بھی ہم نے سماجی علوم کو نظر انداز کیا اور اس میں سب سے زیادہ تاریخ کو نظر انداز

کیا۔تاریخ بیانیہ بن گئی۔تاریخ ہمیں سماج کا ارتقاءاس کا سوشل پراسیس اورلوگوں کی آراء میں مدد دیتی ہے کہ ہم اس کوسوشل کنسٹرکشن کے طور پر پڑھیں۔اگر ہم فقہ کوبھی کلام کوبھی سوشل کنسٹرکشن کے طور پر پڑھتے تو ہمیں اندازہ ہوتا کہ اس میں جس طرح تبدیلیاں آئی ہیں اور جس طرح تبدیلیوں کو لیا گیا ہے یہ بتدریج ان تبدیلیوں کو قبول کرتے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہماری روایت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

یہ شروع سے ایسی ہی ہے اگر سماجی طور پر ہم پڑھتے تو اس سے ہمیں حوصلہ مل سکتا کہ ہم نے ہمیشہ کیلئے تبدیلی کو قبول کیا ہے اور آئندہ بھی اسے قبول کریں گے، مثلاً سیاسی طرح سے خلیفہ کا انتخاب خلفاء کے دور میں چار مختلف طریقوں سے ہوا۔اموی زمانے میں مختلف رہا،عباسی زمانے میں مختلف رہا،ولی عہد آنے شروع ہوئے پھر ایک سے زیادہ خلافتیں بھی وجود میں آئیں۔یہ سارے کے سارے ماوردی اصول سیاست کی دوسری تھیوریز یا کتابیں ہیں ان سب میں ان کو بتدریج اسلامی اصول بنا کر پیش کیا گیا۔حتیٰ کہ عباسیوں کے آخری دور میں جب جرنیل اور سلطان زبردستی خلافت پر قبضہ کر کے بیٹھے تب اس کوبھی اصطلاح اور قہر کے نام سے جائز کیا گیا۔میں اس بات پر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ جب آپ نظری پر زور دیں گے اور اس کی حقیقت یا اس کی سماجی اصل پر توجہ نہیں دیں گے اور اس کی تاریخ کو نہیں پڑھیں گے اور جو ہر فکر کے پیچھے تاریخیت ہے اس کو نہیں دیکھیں گے تو اس وقت تک ہم اس کو صحیح طریقے سے سمجھ نہیں سکیں گے۔آج کے دور میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ہم اس پر نظر نہیں ڈال سکتے۔علوم کی، رہن سہن کی آبادیات، ہجرت کی یہ سب تبدیلیاں ہیں۔

میں آخر میں یہ بات کہنا چاہوں گا کہ اگر ہم اختلاف اور تنوع کے حساب سے تعلیم کو دیکھیں تو ہم پرائمری، مڈل اور اعلیٰ تعلیم میں فرق نہیں کرتے۔ہم اعلیٰ تعلیم کی بات کرتے ہوئے اخلاقیات کی باتیں کرتے ہیں اور یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔یہ علوم بھی نکال دیں جہاں تک بنیادی مہارتوں کی بات ہے۔اخلاقیات کے بنیادی اصول پرائمری تک مکمل ہو جانے چاہئیں اس کے بعد جو دوسرا درجہ ہے اس میں کتابیں کیسی پڑھی جائیں اس میں سے نوٹس کیسے لیں یہ پڑھایا نہیں جاتا۔نظری طور پر ہم پڑھتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ

جس کتاب کو پڑھتے ہیں اس کو ہم اپنے نقطہ نظر سے پڑھتے ہیں۔ہمیں یاد بھی وہی رہتا ہے۔وہ کیا کہہ رہا ہے اس کا طرز استدلال کیا تھا وہ کس سیاق وسباق میں بات کہہ رہا ہے، ہم اس کے نوٹس نہیں لے سکتے۔

نتیجہ پھر کیا ہوتا ہے کہ جس وقت ہم تحقیق بھی کرتے ہیں تو اس میں غزالی، طحاوی اور ابن العابدین کا کہ وہ کس فقہ سے تعلق رکھتے تھے ان کی فکر کا سیاق وسباق کیا تھا اس کی طرف ہم توجہ نہیں دیتے۔فکری تشکیل میں تجزیاتی مطالعات نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے علوم اسلامیہ کا کوئی ڈسپلن نہیں بن سکا۔چاہے وہ اسلامیات ہے یا علوم اسلامیہ ہے اس کا کوئی علمی ڈسپلن طے نہیں ہے۔علمی روایات میں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد علم الکلام ہے یعنی استدلال کیا ہوگا وہ شرعی طریقے سے ہوگا یا مدظلی طریقے سے، وحی اس کی بنیاد ہوگی یا عقل انسانی ہوگی اس بحث میں زیادہ توجہ نہیں۔ڈسپلن کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کچھ اصول ہوں گے۔جیسے فقہ کے یا حدیث کے اصول ہیں۔اس کے موضوعات ہوں گے اس کی تعریف ہوگی اور پھر اس کے اغراض ومقاصد ہوں گے اس وقت ضرورت ہے کہ ہم علوم اسلامیہ کو ڈسپلن بنانے کی کوشش کریں۔

آج کی نشست میں بھی بات ہوئی کہ یہ کام نصاب ونگ یا حکومت کرے گی۔

میرا خیال ہے کہ ہم پڑھاتے وقت جن تجربات سے گزرتے ہیں یہ ان بیوروکریٹس کی سمجھ میں نہیں آسکتا یہ ہماری سمجھ میں ہی آئے گا۔اس لئے ہمیں ہی ڈسپلن طے کرنا ہے اس لئے ہمیں تاریخیت کی بھی ضرورت ہے کہ تمام ڈویلپمنٹ کو سمجھیں۔

دوسرا سماجی علوم یعنی بہت سارے علوم کی تشکیل سماج سے ہوتی ہے یہ نظری تشکیل نہیں ہوتی۔ہم جتنے بھی سماجی علوم کو علوم اسلامیہ میں لاسکیں اتنا بہتر ہوگا۔پرائمری اور اعلیٰ تعلیم میں فرق کرنا ہوگا۔پرائمری میں پڑھنے، لکھنے، ہم آہنگی کی میل جول کی تربیت دینی ہوگی۔اگر اس دور میں ہم نے اس کو تنگ نظری دکھائی تو پھر آگے چل کر خرابی ہوگی۔اعلیٰ تعلیم میں مکمل فکری آزادی کی ضرورت ہے کوئی سنسر نہیں ہونا چاہیے کہ یہ کتاب نکال دیں فلاں ڈال دیں۔یہ اساتذہ کا کام ہے کہ وہ طلباء کی رہنمائی کریں کہ علمی طریقہ استدلال کیا ہے۔یہ تبھی ہوسکتا ہے جب ہم اصول حدیث اور اصول فقہ پڑھاتے ہوئے اس میں یہ بتائیں کہ ہمارے مختلف اکابرین میں اختلاف

کی بنیاد کیا تھی۔ اسباب کیا تھے اور اس کے ماخذ کیا تھے۔ جب ہم ان کو بتائیں گے کہ ان کے ماخذ بھی علمی تھے اور وہ بھی قرآن وسنت کی تعبیر سے کرتے تھے تو بہت حد تک ہم اس منافرت اور عصبیت کو رد کر سکیں گے۔

ہمیں دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنا ہوگا ہمارے ہاں چاہے تقابل ادیان ہے چاہے مسالک کی بحث ہے چاہے تاریخ ہے ہم دوسروں کو اپنے نقطہ نظر سے پڑھتے ہیں اور دوسروں کے نقطہ نظر کو اہمیت بھی نہیں دیتے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا ہمارے نقطہ نظر کو ہمارے نقطہ نظر سے سمجھے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا تبادلہ خیال علمی نقطہ نگاہ سے ہو تو ہمیں دوسرے کا اعتماد حاصل کرنا ہوگا کہ ہم ان کی بات کو سمجھ کر بات کر رہے ہیں ویسے بھی یہ دوسرے کا حق ہے کہ جب آپ اس کے بارے میں بات کہتے ہیں تو اس کے نقطہ نظر کو سمجھ کر بات کریں۔

عنوان: پاکستان میں مسلکی و مذہبی تنوع اور مذہبی اداروں کا کردار

مقرر: خورشید ندیم

علم کی دنیا میں انسانی سعی و جو کا حاصل کبھی حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ زندگی ایک مسلسل ارتقا پذیر عمل ہے اور انسان کی سوچ و بچار کا عمل بھی کبھی تھمنے میں نہیں آتا۔ انسان کے علم اور مشاہدے میں اضافہ ہوتا ہے جس کا اثر اس کے خیالات اور افکار پر پڑتا ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہیں۔ اس لئے کوئی بات اس تابع کے ساتھ نہیں کی جاسکتی کہ یہ اس موضوع پر حرف آخر ہے اور نہ یہاں کہی گئی کوئی بات یہ مفہوم رکھتی ہے کہ وہ اپنے باب میں کوئی حرف آخر ہے۔ گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ ان پر غور کریں۔ یہ ممکن ہے کہ اس کے بعد آپ جس سوچ پر کھڑے ہیں اس میں استحکام پیدا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ آپ نے سوچا ہے اس پر آپ کو نظر ثانی کی ضرورت ہو۔ اس مشقت کا حاصل بس اتنا ہی ہے۔ کسی خاص فکر پر آپ کو پہچانا اس نشست کا نہ مطلوب ہے نہ ہوسکتا ہے۔ علامہ اقبال جیسا جلیل القدر عالم جب اپنے خطبات مرتب کرتا ہے اور اس کا دیباچہ لکھتا ہے تو وہ بھی اس بات کو قبول کرتا ہے کہ فلسفیانہ غور وفکر میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی۔ میں جو بات کہہ رہا ہوں یہ بہت ممکن ہے آنے والے

ادوار میں یہ ترک قرار پائے۔ اس لئے انسانی غور وفکر کا جتنا عمل اور روایت ہے اس کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے اور اپنے آپ کو ہمیشہ آمادہ رکھنا چاہیے کہ کوئی نئی بات نئی سوچ آپ کے ذہن پر دستک دیتی ہے تو اپنے ذہن کے دروازے اس کیلئے کھول دینے چاہئیں۔ مذہبی تنوع کی انسانی زندگی میں ہونے والی تجسیم کے دو دائرے ہیں۔ ایک دائرہ وہ ہے جس کا ظہور مختلف مذاہب کی شکل میں ہوا، اسلام، مسیحیت، یہودیت، ہندومت، بدھ مت، یہ مذہبی تنوع کا ایک دائرہ ہے جو ہم اپنے مشاہدے، اپنے تجربے کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ مذہبی تنوع کا دوسرا دائرہ وہ ہے جو ایک مذہب کے اندر ہے جس کے نتیجے میں مختلف مسالک وجود میں آتے ہیں۔ مذہبی تنوع کو جب ہم سمجھیں اور اس کو مذہبی رواداری کے ساتھ جوڑیں تو دونوں دائرے ہمارے سامنے رہیں اس سے بحث کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔

تنوع کوئی بھی ہو اس کا ایک ظہور فطری ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان ایک ہی ذہنی سانچے کے ساتھ تخلیق نہیں کیا۔ دو افراد کا ذہنی سانچہ ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اگر ایک موضوع پر دونوں غور کریں تو دونوں کے نتائج فکر میں بھی یکسانیت ہو۔ تنوع کا ایک فطری دائرہ ہے جو مذہب میں بھی ظہور پذیر ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں مذاہب بھی وجود میں آتے ہیں اور مسالک بھی وجود میں آتے ہیں۔ تنوع کا دوسرا دائرہ وہ ہے جو مفادات سے جنم لیتا ہے جس کے نتیجے میں گروہ مزید گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں اور ایک گروہ کے نتیجے میں کئی گروہ وجود میں آتے ہیں اس کو بھی ایک پہلو سے فطری کہہ سکتے ہیں مگر جب آپ اصلاً مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا کوئی مفاد یا اپنا ایجنڈا ایسا ہوتا ہے جو اس کو دوسروں سے الگ کرتا ہے اور اختلاف پر مجبور کرتا ہے اس کے نتیجے میں بھی انسانی سماج میں اختلاف پیدا ہوتا ہے جس کو ہم تنوع کہہ سکتے ہیں۔ دو مختلف یا کئی مختلف آراء سامنے آتی ہیں۔ مسلمانوں کی روایت میں جو مذہبی تنوع ہے اس کے دو دائرے ہیں۔ ایک وہ جو فطری ہے اور ایک وہ جو وقت کے کسی احساس یا مفاد کے تحت وجود میں آیا ہے جس کے نتیجے میں انسان یا معاشرہ ایک سے زیادہ گروہوں میں بٹا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ مسلمان تاریخ میں ایک کا ظہور، سیاسی میدان میں ہوا جس کے نتیجے میں مسلمان فرقے وجود میں آئے اور دوسرے دائرے کا ظہور مسالک کی شکل ہوا جس کے

نتیجے میں مختلف فقہی اور کلامی مسالک یا مذاہب وجود میں آئے۔مسلمانوں میں فرقے بھی ہیں اور مسالک بھی ہیں۔فرقے اور مسلک کا فرق مذہبی تنوع کو سمجھنے کیلئے بہت ضروری ہے بہت بنیادی ہے۔

میرا احساس یہ ہے کہ فرقہ سیاسی اختلاف کی بنیاد پر وجود میں آیا اور مسالک فطری غور وفکر کے نتیجے میں وجود میں آئے۔مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ میں آپ کو تین بڑے فرقے دکھائی دیتے ہیں۔اہلسنت والجماعت،اہل تشیعہ اور خوارج، یہ تین فرقے ہیں جو سیاسی اختلاف کی بنیاد پر وجود میں آئے۔ثقیفہ بنوسعدہ میں جو کچھ ہوا آپ جانتے ہیں۔اس کی بنیاد کوئی مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھی۔بنیادی سوال یہ تھا کہ رسالت مآبؐ کے بعد امت کی قیادت کس کے ہاتھ جاتی ہے۔ثقیفہ بنوسعدہ میں مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے رہنما جمع ہوئے۔ان پر غور وفکر ہوا اختلاف رائے بھی ہوا۔اس میں جو چیز فیصلہ کن بنی وہ رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے کہ ''العامۃ من القریش''۔

یہ ایک سیاسی ہدایت تھی جس کا پس منظر ابن خلدون نے بعد میں آ کر واضح کیا کہ عرب میں سیاسی عصبیت قریش کو حاصل تھی اس لئے کوئی سیاسی نظم اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک زمام کار قریش کے ہاتھ میں نہ ہوں اس پر اتفاق ہوا اور صدیق اکبرؓ کی خلافت قائم ہوئی۔یہی اختلاف آگے بڑھا تو اس کے نتیجے میں مختلف گروہ پیدا ہوئے۔اسی اختلاف کا دوسرا ظہور سیدنا عثمانؓ کے عہد میں ہوا۔آپ کے علم میں ہے کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت پر جو اعتراضات لوگوں نے اٹھائے۔ان میں سے کوئی اعتراض مذہبی نہیں تھا سب کے سب سیاسی تھے۔اپنے قبیلے کو نوازا یا اپنے عزیز واقارب کو مناصب دیئے۔میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس امت میں دوسرے جس اختلاف کا ظہور بڑے پیمانے پر ہوا وہ بھی اصل میں ایک سیاسی ایشو ہے۔سیدنا عثمانؓ کے سیاسی اقدامات پر گفتگو ہوئی اس کے نتیجے میں آپ کے علم میں ہے کہ کتنا بڑا فساد پیدا ہوا اور مسلمانوں کے اندر کتنے بڑے خلفشار نے جنم لیا پھر صفین اور جمل کو آپ کو دیکھتے ہیں وہ بھی اصلاً سیاسی اختلافات تھے اور اس کی کوکھ سے پھر خوارج نے جنم لیا۔انہوں نے دونوں مسلمان گروہوں کی نفی کرتے ہوئے ایک تیسرے نقطہ نظر کو پیش کیا اور یوں مسلمانوں کے درمیان اختلاف بڑھتا چلا گیا۔یہ سارے اختلافات بنیادی طور پر مذہبی نہیں تھے سیاسی تھے لیکن اس کے نتیجے میں مسلمانوں

کے اندر فرقے پیدا ہوئے۔شیعہ،سنی اور خوارج۔بعد میں جب ان سیاسی اختلافات کو مسلمان معاشرے کے اندر پذیرائی دلانے کی کوشش کی گئی تو ان کو ایک مذہبی لبادہ بھی پہنا دیا گیا۔ہر گروہ نے اپنے مئوقف کے حق میں مذہبی استدلال تخلیق کیا۔وہ گروہ جو سیاسی اختلاف کی بنیاد پر وجود میں آئے جب وہ مذہبی استدلال کی بنیاد پر آگے بڑھنا شروع ہوئے تو پھر وہ مذہبی گروہ بننا شروع ہوئے۔

اس لئے آج جب ہم یہ کہتے ہیں کہ شیعہ ایک مذہبی تعبیر ہے۔سنی ایک مذہبی تعبیر ہے،خوارج بھی مذہبی تعبیر ہے۔اس لئے کہ سب اپنے موقف کے حق میں قرآن اور حدیث کو پیش کرتے ہیں جو اصلاً دین کے ماخذ ہیں سیاست کے ماخذ نہیں ہیں اس کے بعد جو کچھ ہمارے ہاں ہوا۔روایات گھڑی گئیں وہ آپ کے علم میں ہے۔آپ جانتے ہیں کہ محدثین کے ہاں جب وضع حدیث کے محرکات زیر بحث آتے ہیں تو ایک بڑا محرک یہ ہے کہ یہ جو فضائل کی روایات ہیں۔سب نے اپنے اپنے حق میں روایات جمع کیں اور ہمارے علم میں ہے کہ محدثین نے ہمیں بتایا کہ وضع حدیث کے بڑے محرکات میں جو فضائل کی احادیث ہیں وہ گھڑی گئی ہیں۔محرک کیا تھے وہ سیاسی اختلافات تھے جو بعد میں تبدیل ہو کر مذہبی رنگ میں آگئے۔اختلاف کا دوسرا دائرہ فطری ہے۔آپ کے سامنے قرآن مجید ایک ماخذ ہے اور آپ اس کی آیات پر غور کرتے ہیں اس پر تدبر کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں مختلف نتائج فکر تک پہنچتے ہیں۔قرآن وسنت سے مدد لے کر ایک فقہی رائے قائم کرتے ہیں۔کچھ اہل علم یہ کام کرتے ہیں اور ان کی تقلید میں کچھ لوگ جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔جو اس صاحب علم کی استبداد کو درست سمجھتے ہیں تو پھر اس کے نتیجے میں مسالک وجود میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔مسلمانوں کے اندر یہ جو حنفی ہیں،شافعی ہیں،حنبلی ہیں، یہ سارے اختلافات فطری ہیں جو ہمیشہ سے رہے ہیں اور یہ رہے گا۔اگر آپ اپنی تاریخی روایت پر غور کریں تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ فقہی اختلاف نے مسلمانوں کی وحدت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔بلکہ اس نے مسلمانوں کے علمی پوٹینشل کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔یہ اختلاف کی روایت کتنی برتر روایت تھی۔

ہمارے اسلاف کے اندر غور وفکر کا کتنا پوٹینشل تھا کہ جس کے نتیجے میں انہوں نے کبھی

ایک پہلو سے دیکھا کبھی دوسرے سے اور کبھی تیسرے پہلو سے دیکھا اور ان کے نتائج فکر کے نتیجے میں مسالک وجود میں آتے ہیں۔ حضرت سفیان سوری کا ان سارے مسلکی اختلافات کے بارے میں ایک بہت اچھا قول ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ تم جب کہتے ہو کہ فقہا اختلاف کرتے ہیں تو میں یہ کہتا ہوں کہ تم یہ نہ کہو کہ فقہا اختلاف کرتے ہیں تم یہ کہو کہ فقہا نے گنجائش پیدا کر دی یعنی آپ کو اگر ایک مسئلہ درپیش ہے تو آپ کتنے طریقوں سے عمل کر سکتے ہیں۔ ایک زاویہ اس کو دیکھنے کا یہ ہے کہ یہ اختلاف تو بری چیز ہے دوسرا زاویہ فطری ہے کہ ایک مسئلے کے کئی حل ہو سکتے ہیں تو یہ اختلاف گویا رحمت بن جاتا ہے۔ اس لئے میں یہ کہتا ہوں فقہی اختلاف نے مسلمانوں کے علمی پوٹینشل کو نمایاں کیا ہے اور ان کے اندر اس موجود صلاحیت کو نمایاں کیا کہ وہ ہر عہد کے مسائل کو اپنے ماخذ کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں سمجھ سکتے ہیں اور حل پیش کر سکتے ہیں اس کے برعکس وہ اختلاف جو سیاست کے نتیجے میں وجود میں آیا اس نے اس امت کو نقصان پہنچایا۔ اس نے اس امت کو مفادات کی ایسی جنگ میں جھونکا ہے جس کے نتیجے میں ہوا اکھڑ گئی ان کا رعب و دبدبہ ختم ہو کر رہ گیا اور اس کے نتیجے میں ان کی تاریخ لوگوں کیلئے بازیچہ اطفال بن گئی۔

پاکستان کے اندر اس ساری روایت کا ظہور ہوا، فرقہ وارانہ بھی اور مسلکی بھی اور چونکہ ہمارے ہاں سیاسی اختلاف مذہبی لبادے میں سامنے آیا تو ہم نے اس کو اس زاویے میں کہنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فرقے اور مسلک کے اختلاف کو ٹھیک طرح سے نہیں جان سکے اور اس کے نتیجے میں مسلمان معاشرہ خلفشار میں مبتلا ہونا شروع ہو گیا۔

اپنے عہد کو مربوط کرتے ہوئے میں بہت اچھی مثال آپ کے سامنے رکھتا ہوں کہ مڈل ایسٹ کے اندر ایران اور سعودی عرب کی جنگ بنیادی طور پر ایک سیاسی جنگ ہے۔ خلیج کے اندر کون سی طاقت اپنی طاقت میں اضافہ کرنا چاہتی ہے یہ اقتدار اور اثر و رسوخ کی جنگ ہے جس کیلئے مذہب کو استعمال کیا گیا یہی جنگ جب ہمارے ہاں آتی ہے تو پھر وہ ہمارے اندر اختلافات کو جنم دیتی ہے اور ہمیں گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ ایک طرف لوگ اٹھتے ہیں تو حرمین کانفرنس شروع کر دیتے ہیں دوسری طرف لوگ اٹھتے ہیں تو بحرین کانفرنس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس کی اساس مڈل ایسٹ کے اس سیاسی جھگڑے میں ہے جس نے مذہبی لبادے میں ظہور کیا

اور پھر آپ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پاکستان کے اندر مذہبی تنوع کو جاننے اور سمجھنے کیلئے بنیادی بات یہ ہے کہ ہم مسلک اور فرقے کے فرق کو واضح رکھیں اور یہ جانیں کہ جو فرقے کا فرق ہے وہ بنیادی طور پر سیاسی طور پر وجود میں آیا ہے۔ اس کی تشکیل سیاسی پس منظر سے ہوئی اور اس کو مذہبی لبادہ دے دیا گیا اس کے برخلاف دوسری روایت ہے جو قرآن و حدیث پر غور و فکر کی روایت ہے اس نے نئے نئے خیالات کی جگہ پیدا کی اس نے مسلمان معاشرے میں اٹھنے والے مسائل کو حل کرنے کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ہمارے ہاں بدقسمتی یہ ہوئی کہ جب ہم نے مسلک اور فرقے کی روایت میں فرق کو نظر انداز کیا تو اس نئی تحریک کو جو غور و فکر کے نئے راستے کھول رہی تھی اس کی حوصلہ شکنی کی ہم نے یہ خیال کیا کہ گویا گمراہی کے راستے ہیں جو کھل رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں ہم نے اس مسلم پوٹینشل کو روکنے کی کوشش کی جس نے ہماری تاریخ میں ظہور کیا تو ہمارے فقہی مسالک وجود میں آئے اور ہمارا علمی پوٹینشیل لوگوں کے سامنے آیا۔ ہم نے تقلید کے نام پر اس کو روکنے کی کوشش کی اور ان کے نام پر مسلمان معاشرہ جمود کا شکار ہونا شروع ہوا اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ مذہبی تنوع کس طرح سے ہمارے لئے ایک صحت مندانہ رجحان کی بجائے تخریبی رجحان میں تبدیل ہو گیا ہے۔

جہاں تک دوسرے اختلاف کا تعلق ہے جو میں نے ابتدا میں عرض کیا کہ بین المذاہب اختلاف ہے اس کا احساس شروع میں اس لئے نہیں ہوا کہ 97 فیصد یہاں مسلمان آبادی ہے۔ ہمیں بین المذاہب اختلاف کا پورے طریقے سے ادراک نہیں ہو پایا۔ سوسائٹی کی شعوری تربیت کس طرح سے کی جائے کہ وہ جو مذہبی تنوع سے اس کا پوری طرح سے ادراک کر سکے چنانچہ آج کے دور میں اقلیتوں کے معاملے پر جب ساری دنیا حساس ہونا شروع ہوئی اور پاکستان کی اقلیتیں بھی زیادہ وو کل ہونا شروع ہوئیں اور ان کے اندر بھی اپنے وجود کا احساس نمایاں ہونا شروع ہوا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ مذہبی تنوع نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے چنانچہ ابھی حال ہی میں جو بہت سارے مسائل اقلیتوں کے تناظر میں سامنے آئے ہیں ابھی ہمارا معاشرہ اس کو پورے طریقے سے سمجھ نہیں سکا کیونکہ اس کا عملی تجربہ ہمیں نہیں تھا۔ اقلیتوں کے مسائل نے بین الاقوامی سطح پر بھی آپ کیلئے مسائل پیدا کیے اور قومی وحدت کو بھی متاثر کیا۔ اس لئے دوسرے دائرے کو بھی ہمیں سوچ و بچار کا

موضوع بنانا ہوگا۔ اگر یہ دونوں باتیں آپ کے ذہن میں رہیں کہ ایک مذہبی اختلاف اور دوسرا مسلکی اختلاف تو اس کے بعد میں دوسرے دائرے میں داخل ہوتا ہوں جس کا تعلق ہمارے مذہبی اداروں کے ساتھ ہے۔

برصغیر کی روایت میں بدقسمتی سے روایتی مذہبی اداروں میں جس میں مسجد اور مدرسہ ہے۔ ان مذہبی اداروں نے مسلمانوں کے مسلکی پوٹینشل کو پوری طرح سے سراہا نہیں اس کے نتیجے میں مذہبی اختلاف کو اتنا بڑھا دیا گیا بنیادی طور پر آپ کیلئے جو رحمت کی چیز تھی وہ ہمارے لئے زحمت بن گئی ہم نے ایک دوسرے کو کافر کہنا شروع کر دیا اور دائرہ اسلام سے نکالنے کی تحریک کا آغاز کیا۔ یہ عمل ہمارے مذہبی اداروں سے شروع ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ کون لوگ تھے جنہوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کی تکفیر کا فتویٰ دیا مولانا حمید الدین فراہی جیسے لوگوں کی تکفیر کی، وہ کہاں سے آئے۔ بعد میں جن لوگوں نے اس روایت سے اختلاف کیا ان کو بھی تکفیر میں لپیٹ دیا گیا۔ خود مودودی مذہب، مودودی فرقہ اور اس طرح کی کتابیں بھی ہمارے ہاں لکھی جانے لگیں۔ دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ جو مذہبی ادارے یا مدارس قائم ہوئے ان کی تنظیم مسلک کی بنیاد پر ہوئی۔ دین کے ادارے نہیں بنائے چنانچہ ہمارے ہاں آج بھی دینی مدارس کی جو گروہ بندیاں ہیں وہ مسلک کی بنیاد پر ہیں۔ ہم نے اپنی دینی تعلیم کو قرآن وسنت کی بنیاد پر آزادانہ غور وفکر کی بجائے مسلک کی بنیاد پر کھڑا کیا اس سے ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا معاشرہ مسلک کی بنیاد پر تقسیم ہوتا چلا گیا۔ یہی لوگ جب مدارس سے فارغ ہوئے تو انہوں نے مسجد کی بنیاد بھی مسلک پر رکھی۔ یہ بریلویوں کی مسجد ہے، یہ دیوبندیوں کی مسجد ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلک کی بنیاد پر مسجدوں پر قبضہ کرنے کی کتنی بڑی تحریکیں یہاں اٹھیں اور اس کی بنیاد پر لوگوں کے خون تک کو مباح سمجھا گیا۔ جب مسجد اور مدرسہ دونوں مسلکی ہوں گے تو معاشرے میں لوگوں کی شناخت بھی مسلکی ہوگی۔ اس لئے ہم لوگوں سے اس کا مسلک پوچھتے ہیں، ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ تم سنی ہو یا شیعہ ہو، پھر بریلوی ہو یا دیوبندی ہو۔ سماج میں مسلمان کی شناخت نہیں۔ شیعہ سنی کی شناخت ہے اور اس کے نتیجے میں ہمارا سماج مختلف فرقوں میں تقسیم ہونا شروع ہو گیا اور اس کا شاخسانہ آج ہم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہیں۔

جہاں تک مذہبی اختلاف کی بات ہے وہ کبھی ہمارا موضوع ہی نہیں بن سکا۔ ہم آج تک یہ نہیں جان سکے کہ ایک مسیحی کیا ہوتا ہے۔ ہم مسیحی کو ہمیشہ ایک مسلمان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم تقابل ادیان کے نام سے جن علوم سے واقف ہیں وہ اصل میں اسلام کی دیگر ادیان پر برتری غالب کرنے کا علم ہے جس کو ہم تقابل ادیان کہتے ہیں۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ کوئی عالم اگر اپنے مذہب کی برتری دوسرے مذاہب پر قائم کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کا حق ہے لیکن علم کی روایت میں جب آپ کوئی چیز پڑھانے لگتے ہیں تو ذہانت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہر مذہب کو اس کے اصل مراجع سے اس مذہب اور اس روایت کو جانیں اور وہ علم ہی طلباء کو دیں۔ اس کے بعد ان کا حق ہے کہ وہ کس طرف جاتے ہیں اور کون سا رخ اختیار کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ روایت سرے سے ہی موجود نہیں ہے۔

میرے نزدیک تین چار چیزیں بہت توجہ طلب ہیں ایک تو یہ کہ مذہبی تنوع کے دائروں کو ٹھیک طرح سے سمجھیں، مذاہب کا دائرہ اور بین المسالک فرق کا دائرہ اور دوسرا اختلاف کے دو دائرے ہیں ایک فطری ہے اور دوسرا مفاداتی ہے۔ ان دونوں میں فرق کو جانیں اور تیسری چیز یہ ہے کہ سماج کے اندر جب آپ طالب علموں کو پڑھائیں تو یہ دیکھیں کہ اس کے نتیجے میں مذہب سماجی رواداری کو فروغ دے رہا ہے یا مذہب کی بنیاد پر معاشرہ تقسیم ہو رہا ہے۔ مثلاً جب آپ سیرت کو پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے سیرت کو کبھی سماجی اعتبار سے نہیں پڑھا۔ رسالت مآبؐ نے تیرہ برس مکہ کے معاشرے کے ایک رکن کے طور پر گزارے آپ کی زندگی کیسی تھی۔ اسوۂ حسنہ کیا ہے۔ آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو مذہبی اعتبار سے ایک متنوع معاشرے کی ایک طرح سے آپ ﷺ نے سیاسی تجسیم کی۔ یہ کن بنیادوں پر کی، لوگوں کے سماجی اور سیاسی حقوق کا اظہار کس طرح سے کیا اور سماج کے اندر اس مذہبی اختلاف کو آپ ﷺ نے کیسے کیا۔ ہم نے کبھی سماجی اعتبار سے سیرت کا مطالعہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر الطاف حسین لنگڑیال:

خورشید صاحب کا خطبہ اچھا تھا انہوں نے سیاست و مذہب کی بات کی۔ ماوردی اور دوسرے علماء جو سیاست کی تعریف کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا انہدام سیاست کی وجہ سے نہیں کم علمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں ثقیفہ بنوسعدہ کے وقت بھی لوگوں نے کہا کہ جس کو رسول اللہ ﷺ نے ہماری نماز کا امام بنایا پہلے وہی ہماری سیاست کا بھی امام ہوگا۔ اس طرح حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں سامنے آنے والے اختلافات صرف سیاسی نہیں تھے فقہی بھی تھے، علمی بھی تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے انہدام کی اصل وجہ علمی تھی۔ دوسری بات یہ کہ مدارس کی وجہ سے جو خرابیاں سامنے آئی ہیں لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا ان میں کچھ خوبیاں بھی ہیں۔

رائے:

عبدالصمد ہارون شیخ

فقہی اختلافات معمولی نوعیت کے ہرگز نہیں، تقریباً دو تہائی مسائل پر اختلافات موجود ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفار بخاری :

اختلاف کے معاملے پر بھی مختلف آراء ہیں بعض کہتے ہیں کہ اختلاف مستحسن ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔

رائے:

ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے افغانی اور سرسید کے حوالے سے بات کی ہے افغانی جدید تعلیم کے مخالف بھی نظر آتے ہیں اور حامی بھی۔ عبدہ ان کے شاگرد ہیں انہوں نے عرب میں وہ کچھ کیا جو سرسید نے ہند میں کیا تھا اسی لئے یہ کہنا کہ افغانی جدید تعلیم کے خلاف تھے صحیح نہیں ہے۔ افغانی کے بارے میں بہت سی بات غلط منسوب کی گئی ہیں۔ اسی طرح بریلوی اور دیوبندی تقسیم بھی مذہبی ہے اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جوابات:

ڈاکٹر خالد مسعود

مدارس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ صرف علمی ادارے ہیں اور مسلکی کوششیں صرف علمی ہیں درست نہیں کیونکہ ان کی اپنی سیاسی جماعتیں ہیں۔ اپنی پرنٹنگ پریس ہیں۔ اس میں سیاسی مفادات اور سیاسی بحث شامل ہیں۔ یہ سوال ضرور ہے کہ ہم سیاست کو برا نہ کہیں یہ بھی ایک پہلو ہے مگر گلہ یہ ہے کہ اگر علم کی قیمت پر سیاست ہو تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایک اور نقطہ جو یہاں اٹھایا گیا وہ میری گفتگو میں تقلید اور اختلاف کا ہے۔ کہا گیا کہ اختلاف کو تو قرآن مجید میں بھی پسند نہیں کیا گیا میں اس سے اختلاف کروں گا۔ کیونکہ قرآن مجید میں اختلاف اور تنوع کو اللہ کی آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری طرف اختلاف کا ذکر ہے وہ مذہبی گروہوں کا ہے کہ بینات آنے کے بعد ہی انہوں نے اختلاف کیا۔ وہاں اختلاف کا مطلب بینات کو رد کر کے بات کرنے کا ہے۔ وہاں کوئی نیا فکری نقطہ نظر پیش کرنے کا نہیں ہے۔ بہر حال اس پر گفتگو جاری رہے گی۔ میں اس میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ کوئی بھی کلامی کتاب یا تفسیر آپ اٹھا لیں تو اس میں سب سے زیادہ زور اکابرین، علماء کے مختلف اقوال بیان کرنے پر ہے اس اختلاف کو مسلسل جاری رکھا جاتا ہے اور پھر اس پر مفسر یا فقیہ اپنی رائے دیتا ہے۔ میں نے اس لئے کہا تھا کہ تقلید اختلاف کو محفوظ کرنے کیلئے ہے کیونکہ اختلاف اجتہاد کے ہم معانی ضرور ہے لیکن اختلاف اور اجتہاد میں بعد میں جو فرق آیا ہے وہ یہ کہ اجتہاد کے مختلف مدارج طے کر دیئے گئے اور اس میں ایک اجتہاد جس کی ضرورت تقلید کے بعد نہیں سمجھی گئی وہ یہ تھا کہ جو فقہی مذاہب بن چکے ہیں ان کے بانیان کے اصولوں کے اندر رہتے ہوئے مذہب کے اندر رائے زنی ہوگی اجتہاد ہوگا۔ اس میں ایک اجتہاد مذہب کے اندر رہتے ہوئے ہے ایک اجتہاد جس میں مختلف آراء ہیں۔ اگر آپ فقہ کی پوری تاریخ دیکھیں تو سولہویں صدی کے بعد زیادہ تر کتابیں لکھی گئیں جن میں اس اختلاف کو دور کرنے کیلئے مختلف قسم کی کوششیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ کسی بھی مذہب کے آئمہ اور ان کے اصحاب میں جو اختلاف ہے اس کو کیسے حل کیا جائے اس کا کیا فارمولہ ہوگا اور کس اختلاف کو کیا درجہ دیا جائے گا۔

دوسرا جو مذہب کی کتابیں یا ان کے نصوص ہیں ان میں کیسے درجہ بندی کی جائے گی۔اس میں سے ایک مسئلہ ترجیح کا تھا کہ مجتہد جو مختلف اقوال میں سے ترجیح کرنے کے ماہر ہیں۔سولہویں صدی میں یہ کوشش کی گئی کہ اختلافی امور میں سے جن پر اتفاق ہے یا جس میں ترجیح دی جا سکتی ہے اس کو تدوین ترجیح کا نام دیا گیا۔ اس پر بہت ساری کتابیں لکھی گئیں حنفی فقہ کی کتاب ملتقی الابحُر ہندوستان میں فتاویٰ عالمگیری،اس کے باوجود اختلاف کو کم کرنے یا اس میں فیصلہ کرنے کیلئے لکھی گئیں ان میں بھی یہ انتظام،فتاویٰ عالمگیری دیکھ لیں ملتقی الابحُر دیکھ لیں۔اس میں پھر وہی بتایا گیا کہ ان آئمہ اور اصحاب میں دو اقوال ہیں یہاں تین اقوال ہیں یہاں اختلاف ہے۔افغانی کے لحاظ سے بھی میں آپ کی بات سے اختلاف کروں گا ایک تو یہ اختلاف کہ افغانی اور محمد عبدہ اور سرسید کے مئوقف میں بہت زبردست فرق ہے۔سرسید سائنس کو اہم سمجھتے ہوئے یہ کہتے تھے کہ قرآن کریم کی آیات کو اور سائنس کو تطبیق دینے کی ضرورت ہے جبکہ محمد عبدہ اور افغانی کے نزدیک اسلام میں اور سائنس میں تضاد نہیں ہے بلکہ اسلام میں سائنس اور اس میں ندیم الجسر کی کتاب رسالہ حمیدیہ جس میں پوری تفصیل ہے کہ جتنی بھی سائنس کی ایجادات ہیں وہ اسلام کی تائید کرتی ہیں۔سرسید کا نقطہ نظر بالکل مختلف تھا وہ معجزات کے انکار کو ان معنوں میں کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام ''ورڈ آف گاڈ'' ہیں جبکہ اس کی فطرت کے مظاہر ''ورک آف گاڈ'' ہیں۔ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے وہ کہتے تھے کہ قرآن مجید میں ان کو معجزات کے نام سے ذکر نہیں کیا گیا بلکہ قرآن مجید میں جب بھی رسول ﷺ سے معجزے کا مطالبہ کیا گیا تو قرآن مجید نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔سرسید کا کہنا یہ تھا کہ معجزات کی حقانیت کا کوئی مسئلہ نہیں تھا بنیاد یہ ہے کہ سرسید کے نزدیک قوانین فطرت معیار تھے۔افغانی اور محمد عبدہ نے فطرت اور اس کے قوانین کو دہریت کا نام دیا اور پھر جو فتویٰ ''ردالدہرین'' ہے اس میں سے آدھا دہریت کے خلاف ہے۔

سرسید چونکہ استعمار کا حامی تھا یا انگریزوں کی حمایت کی بات کرتا تھا۔افغانی یا دوسرے علماء کیلئے یہ بات قابل قبول نہیں تھی۔افغانی سیاسی آدمی تھے۔سائنس کے بارے میں ان کے جو لیکچر ہیں اس میں ان کا یہ مئوقف نہیں ہے کہ اسلام سائنس کے حق میں ہے یا خلاف ہے ان کا مئوقف یہ تھا کہ سائنس کی ایجادات اسلام کی کوئی مخالفت نہیں کرتیں۔جبکہ سرسید کہتے تھے کہ مسلمانوں کو

سائنس کی تعلیم اس لئے دی جائے کہ اس سے علم جدید پیدا ہوگا اور علم جدید کی بات نہ تو افغانی کے ہاں ہے نہ ہی محمد عبدہ کے ہاں ہے۔علم جدید کا تصور سرسید کے ہاں ان معنوں میں ہے کہ کلام جس پر مسلمانوں کی ساری فکر کی بنیاد ہے وہ علم الکلام نہ سائنس کی ایجادات کو سمجھ سکتا ہے نہ جدید دور کے تقاضوں کو سمجھ سکتا ہے۔اس کیلئے ہمیں جدید علم الکلام کی ضرورت ہے اور اس کیلئے انہوں نے اصول بھی دیئے اور قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی۔اس سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن افغانی نے جس طرح اس کو بالکل رد کر کے اپنے نقطہ نظر سے ساری بات کی وہ صحیح نہیں تھا۔دیانت داری یہ تھی کہ وہ سرسید کے مئوقف کو اسی طور پر سمجھاتے اور اس کے بعد اس کی غلطیاں نکالتے انہوں نے بہت ساری چیزیں جو منسوب کیں وہ سرسید کا موقف نہیں تھا۔

آپ نے استشراق کی بات کی اورینٹلسٹ تو اپنے آپ کو فخر سے کہتے ہیں کہ وہ اورینٹلسٹ ہیں۔آپ جب ان کو استشراقی کہتے ہیں تو آپ ان کو تقریباً رد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔آپ اس استشراق کو اسلام دشمنی کے معنوں میں لیتے ہیں۔آپ کے ہاں اس پر پرچے پڑھائے جاتے ہیں جس میں آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسلام پر حملہ ہے اور دفاع آپ کیلئے ضروری ہے۔دونوں میں فرق ہے جب مستشرقین بات کرتے ہیں تو ان کے موقف سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن وہ آپ کے ہی مصادر سے حوالے دیتے ہیں اس میں کہیں عربی یا اسلام سمجھنے میں ان سے غلطیاں ہوئی ہیں لیکن ان کا جو طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی حکومتوں کیلئے ان کو کہ وہ اس علاقے کو اس کی ثقافت کو سمجھ سکیں انہوں نے اس پر محنت کر کے یہاں کے حالات کے بارے میں ایک طرح سے رپورٹیں دیں۔ایڈورڈ سعید کے بارے میں آپ کو نظر آئے گا کہ انہوں نے استعمار کیلئے راہیں ہموار کیں۔کیا البیرونی نے راہیں ہموار کیں؟ یہ کہہ سکتے ہیں؟ نہیں،انہوں نے جو کام کیا اس میں سے بعض کے لئے استعمار نے فائدہ اٹھایا لیکن ان کا نام تو اب بھی جاری ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ اورینٹلسٹ کی بنیادی دلچسپی زبان ہی تھی۔وہ اپنی ثقافت کو برتر اور دوسری کو کم تر سمجھتے تھے لیکن جو تیسری چیز استشراق کے حوالے سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ قدامت پرستی کے حوالے سے جو وہ کہتے تھے وہ اسی کو اسلام بتاتے تھے اور وہاں جو ماڈرنسٹ لوگ ہیں ان کو وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

شافٹ کے جتنے بھی مئوقف ہیں وہ وہی ہیں جو راسخ العقیدہ لوگوں کے ہوتے ہیں۔مثلاً وہ یہ کہتا ہے کہ اسلامی قانون میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی نہ پہلے آئی ہے۔لیکن تاریخ یہ نہیں کہتی وہ کہتے ہیں کہ امام شافعی اصولِ فقہ کے بانی ہیں۔ہم سب لوگ یہی کہتے ہیں لیکن تاریخی طور پر یہ غلط ہے۔تقابل ادیان کے بارے میں دلچسپ بات ہے۔اسلام کا مطالعہ باہر کی یونیورسٹیوں میں بڑی دیر میں شروع ہوا۔پہلے اسلام کا مطالعہ نہیں تھا، پہلے اسلام کا جو مطالعہ تھا وہ اس طرح تھا جس طرح ہمارا مسیحیت یا ہندومت کے بارے میں ہے۔جب یونیورسٹیوں میں اس کا مطالعہ شروع ہوا تو یہ مسئلہ تھا کہ جب یہ سچا مذہب ہی نہیں ہے تو اس کا مطالعہ کیسے کیا جائے۔پہلے پہل انہوں نے مسلمانوں کی عبادت کے طریقے وغیرہ کا مطالعہ کیا پھر مذاہب کی تاریخ میں اسلام کو شامل کیا گیا۔بہت آخر میں تقابل ادیان آیا وہاں بھی عیسائیت معیار تھی اور باقی مذاہب کو اس حساب سے پڑھنے کے اصول رکھے۔

ہمارے ہاں بھی تقابل ادیان علمی طور پر بہت کمزور ہے۔علوم اسلامیہ میں علمی معیار رکھنے کیلئے اپنی روایت کو بھی لیں۔ہم تقابل ادیان کو بھی باقاعدہ علمی نظم بنانے کی کوشش کریں جس میں اس کے اصول ہوں اور دوسروں کو ان کے مئوقف سے سمجھنے کی کوشش ہو۔

خورشید ندیم:

لنگڑیال صاحب نے فرمایا کہ مسلمانوں کو سیاسی اختلافات سے اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا کہ مسلکی اختلاف سے ہوا۔یہ تاریخ کو دیکھنے کا اپنا اپنا زاویہ نظر ہے۔اگر کسی کا خیال ہے کہ سیدنا عثمانؓ کی شہادت سے اسلام کو نقصان نہیں پہنچا۔جنگ صفین جنگ جمل سے اس امت کو نقصان نہیں پہنچا۔خوارج سے بھی کوئی نقصان نہیں ہوا جس کا شاخسانہ سیدنا علیؓ کی شہادت ہے اگر کسی کے نزدیک سانحہ کربلا سے اس امت کو نقصان نہیں پہنچا تو آپ کو حق ہے کہ آپ تاریخ کی اس تاویل کو قبول کریں مگر میرے لئے تو اس کو قبول کرنا ذرا مشکل ہے۔سیدنا عثمانؓ نے لوگوں سے فرمایا تھا کہ اگر آج تم نے میرا خون بہا دیا تو یہ امت ایک مصلّے پر کبھی جمع نہیں ہو سکے گی۔بدقسمتی سے آپ کا فرمانا صحیح ثابت ہوا۔یہ امت پھر کبھی ایک مصلّے پر کبھی جمع نہیں ہوسکی۔جہاں تک مسلکی

اختلاف کا تعلق ہے اس کی پیدائش فطری ہے وہ صحابہ کے دور میں ہی ہو گئی تھی۔مسالک کی تنظیم بعد میں ہوئی۔نصوص پر غور وفکر اور اس کے نتیجے میں ایک سے زیادہ آراء تک پہنچنا یہی فقہ ہے۔اس کے علاوہ فقہی روایت کیا ہے۔یہ کام تو خود رسالت مآبؐ کے عہد میں شروع ہو گیا تھا۔آپ نے اس کی تحسین فرمائی اور اس کو آگے بڑھایا۔فقہی اصول بہت بعد میں مرتب ہوئے لیکن یہ عمل رسالت مآبؐ کی زندگی میں شروع ہو گیا تھا۔زندگی میں تین چیزوں کے درمیان ہمیں ایک ربط پیدا کرنا ہوتا ہے۔ایک ماخذ علم اور ایک اپنا سماج،ہم دو ماخذ علم کو مانتے ہیں ایک وحی کو اور ایک عقل کو۔اپنے سماج سے مربوط کرتے وقت ایک تکون وجود میں آتی ہے اس کا نام فکر ہے۔یہ فطری ہے یہ ہونا تھا اس کو برکت کی چیز سمجھنا چاہیے تھا کہ اس کے بغیر زندگی آگے بڑھ نہیں سکتی خود رسالت مآبؐ نے جب اپنے صحابہ کی تربیت کی،حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت کو اکثر ہم زیر بحث لاتے ہیں تو راستہ دکھا دیا کہ اس عمل کو کیسے آگے بڑھانا ہے۔اس روایت کی وجہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری علمی روایت ایک زندہ روایت ہے اور آج تک موجود رہی ہے۔سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے حق میں یہ دلیل کہ چونکہ آپ نے رسالت مآبؐ کے آخری ایام میں امامت فرمائی اور یہ امامت صغریٰ آپ کی امامت کبریٰ کیلئے بھی دلیل ہے۔یہ اس دور میں تو کوئی دلیل سامنے نہیں آئی۔میرے علم میں نہیں کہ ثقیفہ بنوسعدہ میں سے کسی نے بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حق میں یہ دلیل پیش کی ہو یا خود جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعتِ عام ہوئی تو آپ نے اس کو کہیں روایت کے طور پر پیش کیا ہو۔ہم آج جب تاریخ پر غور کرتے ہیں تو اس سے استدلال کرتے ہیں لیکن اس عہد میں میرے علم میں نہیں کہ کسی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حق میں اس دلیل کو پیش کیا ہو۔

میں نے سیاسی اختلاف کی مذہبی تجسیم کی بات کی،سیاسی اختلاف کا ہونا بھی فطری ہے لیکن جب ہم سیاسی اختلاف کی مذہبی تجسیم کرتے ہیں تو اس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے اس سے مسلمانوں میں گروہ بنتے ہیں،فرقے پیدا ہوتے ہیں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں سیاسی جماعتیں ہیں اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا لیکن جب ہم مذہب کو بطور سیاست استعمال کرتے ہیں تو اس وقت جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے۔جب 1977ء میں قومی اتحاد کی تحریک بھٹو کے خلاف جاری تھی تو اس ملک میں ایک بہت جید عالم دین نے اس انتخابی مہم کے بارے میں یہ کہا کہ جو لوگ اس

معرکے میں قومی اتحاد کا ساتھ نہیں دیں گے اور گھروں میں بیٹھے رہیں گے ان کا معاملہ ان منافقین کی طرح ہے جو تبوک کے وقت گھروں میں بیٹھے رہے۔ یہ ہے اصل میں سیاسی اختلافات کی مذہبی تجسیم۔ جس کی وجہ سے لوگ آپس میں لڑتے ہیں۔ میں اس کی نفی کر رہا ہوں، سیاسی اختلافات کی نہیں بلکہ ان کی مذہبی تعبیر کی نفی کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

آج بہت علمی گفتگو ہوئی۔ میں صرف دو مزید نقطے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جو بزرگوں سے ہم نے سیکھے ہیں۔ ایک یہ کہ وحی کی کوئی بات خلاف عقل نہیں ہو سکتی وہ بالائے عقل ہے۔ دوسری بات تقابل ادیان کی ہے اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن ڈاکٹر خالد مسعود نے ایک بہت خوبصورت بات کہی کہ اس کے باوجود ہم ایک اسلامی مملکت کے دعوے دار ہیں ہم نے علوم اسلامیہ کو ایک ڈسپلن کی شکل نہیں دی۔ ہم علوم اسلامیہ میں جب ہم ادیان کا مضمون پڑھاتے ہیں تو ہم نے اس کو اب تک ایک ڈسپلن کی شکل نہیں دی۔ میں مثال کے طور پر واضح کروں گا کہ مثلاً جب ہم مسیحیت پڑھاتے ہیں جب ہم ہندومت، بدھ مت، زرتشت پڑھاتے ہیں تو کیا واقعی ہم میں سے کسی بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر نے زرتشت مت کی اصل کتابوں کی تفہیم کی ہے۔ کیا کسی نے پالی زبان میں بدھ مت کی اصل کتاب کا مطالعہ کیا ہے؟ کیا ہم نے وید کو سمجھا ہے؟ کیا واقعی ہم میں کتنے ہیں جنہوں نے تورات اور انجیل کا اس طرح سے مطالعہ کیا ہے جس طرح سے کرنا چاہیے۔ اس طرح جب ہم دوسروں کی لکھی ہوئی باتوں کو آگے بڑھاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ باتیں تو ہماری باتیں نہیں ہیں۔ امریکہ میں فلاڈیلفیا یونیورسٹی وہ پہلی یونیورسٹی ہے جس نے باقاعدہ مذہب کا شعبہ قائم کیا اور اس کے لئے وہ ہر مذہب کا اپنا عالم لے آئے۔ اسلام کے لئے بہت مشہور عالم جس کو پھر قتل کر دیا گیا اسماعیل فاروقی کو رکھا گیا تھا۔ اسی طرح ہندومت کیلئے بدھ مت کیلئے الگ الگ لوگ رکھے گئے۔ اگر ہم اپنی یونیورسٹیوں میں تفہیم ادیان کے نام سے اس مضمون کا تعارف کرائیں تو وہ زیادہ بہتر ہوگا۔

دوسرا دن

پہلی نشست: عدم برداشت اور مذہبی رویّے

صدارت: ڈاکٹر خالد مسعود

مقررین: عمار خان ناصر، محمد عامر رانا

عنوان: عدم برداشت، سماجی ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ

مقرر: عمار خان ناصر

جب کبھی کسی خاص طبقے یا اس کے کردار پر بات کی جاتی ہے اور اس میں اصلاح طلب کچھ پہلوؤں پر توجہ دلائی جاتی ہے یا تنقید کی جاتی ہے تو کم و بیش ہر طبقے کی جانب سے عموماً دو طرح کے ردعمل سامنے آتے ہیں ایک تو فوری ردعمل یہ ہے کہ جب خامیوں کا ذکر کیا جا رہا ہے تو خوبیاں بھی تو بہت ہیں ان کا بھی ذکر کیا جائے۔ دوسرا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ کیا خامیاں صرف ہمارے اندر ہیں۔ معاشرے میں جو دوسرے طبقات ہیں ان میں کوئی خرابی نہیں۔ یہ ردعمل بنیادی طور پر اس تاثر سے پیدا ہوتا ہے اور بعض جگہوں پر وہ تاثر صحیح بھی ہوتا ہے کہ شاید کسی خاص طبقے کو کٹہرے میں کھڑا کر کے اس پر مقدمہ چلانا اور اس کے کردار کو جانچنا یا اس کے بارے میں کوئی منفی فیصلہ دینا مقصود ہے۔ بہت سی جگہوں پر ایسا ہوتا بھی ہے کہ ہم کسی طبقے کو اصلاح کے پس منظر میں نہیں بلکہ اس کے امیج کو مجروح کرنے کی غرض سے یہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اعتدال کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی مجالس میں جب ہم کسی بھی طبقے کو خاص طور پر موضوع بناتے ہیں تو اس محرک کا مقصد یہ پہلو بالکل نہیں ہے کہ ہم اس طبقے کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا چاہ رہے ہیں یا پھر دوسرے طبقوں سے اس کا مقابلہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس طرح کی مجالس میں یہ محرک نہیں ہوتا۔ ان مجالس کا مقصد وہ ہوتا نہیں جو سمجھا جا رہا ہوتا ہے۔ انسان کو اصلاح پسند نہیں، وہ تنقید گوارہ نہیں کرتا، اس لئے دین میں تنقید اور اصلاح کیلئے بہت لمبی چوڑی

حکمت عملی بتائی گئی ہے وہ اسی لئے بتائی گئی ہے کہ انسان کو چڑانا مقصد نہیں بلکہ اس کو اصلاح کی طرف لے کر آنا مقصد ہے اور جب انسان کو یہ گوارہ نہیں ہوتا کہ اس کے کردار یا اس کے قول وفعل پر کوئی سوال اٹھایا جائے تو نفسیاتی طور پر وہ اس سے بچنے کیلئے بہت سے جواز تراشتا ہے۔ اس کا تجربہ آپ کو ہوا ہوگا کہ کسی پلیٹ فارم پر آ کر سارے طبقے بیٹھے ہوں اور ایک عمومی بات کی جائے کہ ہمارے معاشرے میں یہ بگاڑ ہے تو آپ یقین جانیں کہ ہر ایک یہ محسوس کرے گا کہ اس گفتگو کا مخاطب میں نہیں ہوں۔

اس لئے اصلاح کا مقصد عمومی مجالس میں لوگوں تک پہنچتا نہیں، دوسری چیز یہ ہے کہ اگر ہم ہر طبقے میں خود تنقیدی یا خود احتسابی کا جذبہ پیدا کریں تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر طبقے کیلئے اس طرح کی الگ الگ نشستیں ہوں اس لئے میں جو بات کروں گا اس میں بہت سی باتیں ناگوار بھی ہو سکتی ہیں ہم کسی کٹہرے میں نہیں۔ ہم آپس میں بیٹھ کر غور کر رہے ہیں کہ سماج کو جو چیلنج درپیش ہے ہم اساتذہ کا کیا کردار بنتا ہے اور ہم اگر وہ نہیں ادا کر رہے تو اس کیلئے بہتری کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔

یہ جو عدم برداشت یا سماجی ہم آہنگی کا معاملہ ہے یہ اس وقت کتنا بڑا چیلنج ہے یہ کوئی چھوٹا سا مسئلہ نہیں ہے۔ اگر یہ رویہ کسی فرد یا طبقے میں ہو تو اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں لیکن اگر یہ پوری قوم میں سرایت کر جائے تو پھر صورتحال بہت نازک ہو جاتی ہے اور پھر سب کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔

ہمیں اس وقت اس صورتحال کا سامنا ہے ہر طبقے نے اپنے کچھ خول بنا لئے ہیں وہ اس کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں قوم میں جو تقسیم ہے اس کی ایک شکل اہل سیاست میں ہے پھر معاشرے میں طبقاتی تقسیم، مذہبی تقسیم، اقلیت کی تقسیم ہے، قدامت پرست اور لبرل کی تقسیم ہے۔ پھر تعلیم کا مسئلہ ہے، ہم برادریوں میں ہم بٹے ہوئے ہیں۔ سیاست سے لے کر معیشت تک خاندان، مذہب، سکول کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں ہم میں وحدت یا یگانگت کا کوئی پہلو نظر آتا ہے۔ تقسیم در تقسیم ہے اور ہر تقسیم کے ساتھ رویّوں میں عدم برداشت بڑھتی جا رہی ہے۔

دنیا میں اس وقت جو تہذیب غالب ہے انہوں نے کوشش کی کہ وہ اپنے اندر وسعت پیدا کریں وہ کسی بھی رنگ، نسل اور مذہب کے لوگوں کو اپنے اندر جگہ دینے کیلئے تیار ہیں۔ پوری دنیا

سے ذہانت اور صلاحیت کھچی ہوئی جا رہی ہے اس کی وجہ وہاں کی سماجی ہم آہنگی ہے، مذہبی رواداری ہے۔

ہمارے ہاں اہل مذہب کے رویّوں میں کون سی ایسی چیز ہے جو عدم برداشت کا مظہر ہے جو معاشرے میں انتشار کو مزید فروغ دے رہی ہے میں ان میں سے چند کا ذکر کروں گا۔ مذہبی رویّوں میں عدم برداشت پر میں بات کروں گا۔ سب سے پہلی چیز یہ کہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے۔ نفسیاتی امراض کیلئے نفسیاتی و روحانی علاج معالجے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے اپنی دینی روایت میں روحانی تربیت کے عنصر کو کھو دیا ہے۔ حسد، شخصی مفادات، مسابقت، غلو، حد سے آگے بڑھنا، اہل مذہب اور اس کے نمائندوں میں یہ اوصاف نمایاں نظر آئیں گے اس کی وجہ سے وہ معاشرے میں عدم برداشت کو فروغ دے رہے ہیں۔

غلبے اور تسلط کی خواہش فرد میں بھی ہوتی ہے اور قوم میں بھی ہوتی ہے۔ مذہبی رویّوں میں فکری تسلط اور اپنا دائرہ اثر بڑھانے کی کوشش بعض حدود سے تجاوز ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم اختلاف کرتے ہوئے آداب کو بھی پامال کرتے ہیں۔

تیسری چیز جو عدم برداشت کے فکری اسباب میں سے ایک ہے وہ یہ کہ ہم دنیا کے مسلمات سے واقف نہیں۔ ہم اپنی دینی ترجیحات کا تعین اس علمی ذخیرہ یا بحثوں کی روشنی میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اب صدیوں پہلے دنیا سے غیر مطابق ہو چکی ہیں۔ دنیا بدل گئی ہے اس کے مسلمات بدل گئے ہیں میں اس کی ایک مثال دوں گا ہمارے ہاں احمدیوں کو ایک بڑی بحث کے بعد مسلمانوں کے طور پر نہیں بلکہ اقلیت کے طور پر شناخت دی گئی۔ یہ فیصلہ ہماری روایتی مذہبی فکر کے جو معیارات ہیں اس کے لحاظ سے کوئی بہت اچھا معیاری فیصلہ نہیں ہے۔ علماء کا مطالبہ یہ تھا کہ ہمارے فقہی مسائل کی رو سے یہ زندیق و مرتد ہیں اس لئے ان کی سزا قتل ہے اگر علماء کے حق میں اختیار ہوتا تو یہ ان کیلئے اس طرح کا کوئی فیصلہ کرتے کہ احمدیوں کا قانونی طور پر اجتماعی قتل کیا جائے۔ عملی صورتحال اس حل کیلئے سازگار نہیں تھی، علامہ اقبال نے جو حل پیش کیا تھا اس کو تسلیم کیا گیا۔ علامہ اقبال نے یہ کہا تھا کہ ان کو جیسے دوسرے غیر مسلم ہیں اس طرح سے ان کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے تاکہ مسلمانوں کا مذہبی تشخص محفوظ ہو جائے۔ اس کے بعد

یہ دوسرے غیر مسلموں کی طرح معاشرے میں رہیں۔ جب ہم نے قانونی فیصلہ کرلیا تو مذہبی طبقوں کا جورویہ ہے وہ اس فیصلے سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

آئین میں غیر مسلم کے طور پر ایک احمدی کسی بھی منصب پر فائز ہوسکتا ہے جہاں پر مسلمان ہونے کی شرط نہیں ہے۔آپ ہر روز کوئی نہ کوئی مطالبہ دیکھتے ہیں کہ فلاں جگہ فلاں منصب پر فائز احمدی کو ہٹایا جائے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آئین وقانون کی رو سے ہم کون سا مطالبہ کرسکتے ہیں اور کون سے مطالبے کا جواز نہیں بنتا۔

عدم برداشت کا تیسرا بڑا سبب یہ ہے کہ فکری اور فقہی طور پر ہم آج کے دور میں نہیں کھڑے۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ بعض دفعہ ہم یہ متعین نہیں کر پاتے کہ ہمارا دائرہ اختیار کیا ہے۔اگر ہم اپنے دائرہ اختیار سے آگے بڑھ کر کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو یہ دراصل عدم برداشت کا ایک نمونہ ہے۔ممتاز قادری کے کیس میں پورے مذہبی طبقے نے جو پوزیشن لی صریحاً اس کا اقدام قانون سے تجاوز تھا۔لیکن چونکہ مخالف فریق لبرل تھا تو ہم نے اصول پر بات کرنے کی بجائے اس کو جواز فراہم کرنے کی کوشش کی۔ہم نے معاشرے میں یہ پیغام دیا کہ آپ دینی جذبے سے اگر کچھ بھی کر گزریں دائرہ اختیار کا مسئلہ اہم نہیں، غیرت دینی اہم ہے۔ مذہبی لیڈرشپ کے اس اقدام کو بھی موضوع بحث بنانے کی ضرورت ہے۔آخری بات یہ ہے کہ تبدیلی کا سب سے پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کم ازکم اس مسئلے پر گفتگو کریں۔گفتگو کرتے ہوئے آپ کو اس مسئلے کی نزاکت کا احساس ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ وہ مرحلے آتے ہیں کہ آپ اجتماعی طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں اور پھر تبدیلی بڑے پیمانے پر نظر آجاتی ہے۔

توہین رسالت کے غلط استعمال پر اقلیتیں پہلے دن سے شور مچا رہی ہیں پھر اس کا زیادہ استعمال مسلمانوں کے آپس کے تنازعات میں ہونا شروع ہوا۔اکثر یہ ہوتا تھا کہ جب ہم اس پر بات کرتے تو ہم پر طرح طرح کے الزامات لگتے تھے لیکن آج یہ بات اسلامی نظریاتی کونسل کہہ رہی ہے کہ اس کے غلط استعمال کو روکنے کی ضرورت ہے۔ہم جو بھی یہاں باتیں کررہے ہیں وہ رائیگاں نہیں ہیں۔

عنوان: مذہبی بیانیہ، تعلیم اور ریاست

مقرر: محمد عامر رانا

غدر کے بعد جب پورے برصغیر کے مسلمانوں پر مایوسی کے سائے تھے اور مسلمان طبقات سوچ رہے تھے کہ اس صورتحال کا کیسے مقابلہ کیا جائے۔علی گڑھ کی تحریک، دیوبند کی تحریک اور کئی طرح کا علمی، سماجی اور سیاسی محاذ کھلتے رہے اور ان کے افزائش ہوتی رہی۔ایک ردعمل رنگون کے مولوی عبدالکریم نے دیا۔ ہمارے ہاں ابھی تک ایک روایت رہی ہے کہ ایک آنے کی جنتری لکھی جاتی تھی جس میں کیلنڈر کے علاوہ بہت ساری معلومات بھی ہوتی تھیں اور ہر جنتری کا کوئی نہ کوئی خالق ہوتا تھا جس کے نام سے یہ مشہور ہوتی تھی۔رنگون کے اندر مولوی عبدالکریم کی جنتری بڑی مشہور تھی اس دوران مختلف ردعمل بھی سامنے آرہے تھے کہ اس صورتحال سے کیسے نمٹا جائے؟ انہوں نے 786 کی اپنی جنتری میں ایک نئی شرح کی۔انہوں نے مسلمانوں کو حوصلہ دیا کہ گھبرانے کی بات نہیں بلکہ آج سے 100 سال بعد رنگون مسلمانوں کا مرکز ہوگا۔انہوں نے 786 کی اس طرح سے تشریح کی، وقت گزر گیا اور اس واقعہ کے 120 سال کے بعد وہ جنتری ایک قوم پرست بدھ رہنما ویراتو کے ہاتھ لگ گئی۔ویراتو نے کہا کہ یہاں پر جو مسلمان ہیں ان کا منصوبہ برما کے اوپر قبضے کا ہے اور اس کے شواہد یہ ہیں کہ یہ بچے بہت زیادہ پیدا کررہے ہیں اور یہ ہماری لڑکیوں کو مسلمان کرکے ان سے دوسری شادی کرتے ہیں۔ویراتو نے مسلمانوں کے خلاف ایک پورا مقدمہ بنایا۔

اب صورتحال ہمارے سامنے ہے کہ گزشتہ 16 سال سے برما کے اندر مسلمان روہنگیا کا راکھائن کے ساتھ جو تصادم ہے وہ کیا صورتحال اختیار کرگیا ہے۔یہ ایک بیانیہ تھا جو شاید نیک نیتی سے مولوی عبدالکریم کی طرف سے تشکیل دیا گیا تھا اس کو استعمال کیا مانک ویراتو نے۔ مانک ویراتو کو سمجھانے کیلئے کئی کاوشیں ہوئیں۔ برما کے اندر وہ مسلمان جو کسی نہ کسی طرح سے وہاں کی اشرافیہ کا حصہ بھی ہیں انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ملائیشیا، انڈونیشیا، سعودی عرب سے سرکاری وفد بھی گئے۔ پاکستان سے بھی وفد گیا جس میں، میں اور ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب بھی

تھے تاکہ انتہا پسند بدھوں کو سمجھایا جائے کہ 786 کا اسلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اسلام کا یہودیوں کی طرح کا کوئی خفیہ پروٹوکول نہیں ہے۔ لیکن ابھی تک وہ اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ مسلمانوں کے کوئی خفیہ پروٹوکولز نہیں ہیں جو برما میں اور بدھ علاقوں کو کنٹرول کرنے کیلئے وہ استعمال نہیں کریں گے۔ 786 کے مقابلے پر انہوں نے پوری تحریک شروع کی۔ جس کا نام 696 رکھا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں انہیں 696 کی حکمت عملی سے روکنا ہے ایک تو ان کی نسل کشی کرنی ہے دوسرا اپنی بچیوں کو روکنا ہے کہ وہ ان کے ساتھ شادی نہ کریں۔ اس طرح کا پورا ایک چارٹر انہوں نے بنا رکھا ہے۔ پاکستان کے تناظر کے اندر اس مثال کا اور اس بیانیہ کا شاید براہ راست تعلق نہیں ہے لیکن کیا کبھی ہم نے غور کیا کہ بہت سارے ایسے ابہامات ہوسکتے ہیں بہت سارے ایسے بیانیے ہوسکتے ہیں جو شاید ہم نے دوسرے فرقے کے لوگوں کے متعلق سوچ رکھے ہوں۔ کیا ایسے ابہامات اور بیانیے ہم نے دیگر مذاہب کے بارے میں ان غیر مسلموں کے بارے میں رکھے ہوئے ہوں اور ہم ان کی بات سمجھنے کیلئے تیار نہ ہوں جیسے کہ مونک ویراتو تیار نہیں ہے۔ کیا کسی نہ کسی سطح پر ہم ایسے ابہامات کا شکار تو نہیں ہیں۔ یہ میرا آپ کے سامنے سوال ہے۔

میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ جو ابہامات یا ذہنی وفکری الجھنیں ہیں ان کا تعلق کسی نہ کسی طور پر ہماری شناخت کے مسئلے کے ساتھ ہے۔ ہم من حیث القوم ابھی تک یہ طے نہیں کرسکے کہ ہم کیا ہیں اور ہمارے سماج کی نوعیت کیا ہونی چاہیے اس قومی ریاست کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ چند سروے جو پیو کے یا گیپ پاکستان کے ہیں وہ بڑی عجیب وغریب قسم کی صورتحال پیش کرتے ہیں۔ جو ان ابہامات کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ اس سروے میں ہماری اپنی رائے سے جو ہماری لوگوں نے دی ہے مثلاً گیلپ کا ایک سروے ہے کہ پاکستان میں شریعت کے نفاذ کی خواہش تمام مسلمان ممالک میں سب سے زیادہ ہے جو 91 فیصد ہے۔ 59 فیصد پاکستانی اپنی پہلی شناخت مذہب کو قرار دیتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ 20 فیصد یہ بھی کہتے ہیں کہ میری پہلی شناخت پاکستان کی ہے۔ صرف آٹھ فیصد یہ کہتے ہیں کہ ہماری کوئی لسانی یا نسلی شناخت بھی ہے۔ دس فیصد کہتے ہیں کہ ہم تو بنیادی طور پر انسان ہیں۔ شناخت کے حوالے سے یہ جو ابہام ہے اس کی وجوہات کیا ہیں۔ کیا یہ ریاست کی کوئی حکمت عملی ہے کہ وہ اس قسم کے رویّوں کو پروان چڑھائے یا یہ اس نصاب سے

متعلق ہے جو ریاست نے دیا۔ یا اس کا تعلق اس عمل تدریج سے ہے جو آپ نصاب سے ہٹ کر سمجھتے ہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ ریاست جس قسم کے شہری تیار کرنا چاہتی ہے وہ بالکل غلط ڈیزائن ہے، ریاست کو بالکل نہیں پتہ کہ ہماری نئی نسلیں کیسی ہونی چاہئیں اور ان کی سمت کس طرف ہونی چاہیے یا اس کے ذہنی رویّے کی تشکیل مجھے خود کرنی ہے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے جو میرا آپ سب سے ہے۔ شناخت کے ساتھ ساتھ رویّے ہمارا امیج بناتے ہیں۔ تو کیا ہمارے رویّے مختلف بیانیوں کی مدد سے تشکیل پاتے ہیں۔ کیا یہ ہمارا کوئی اجتماعی شعور ہوتا ہے جس پر ہم اتفاق رائے کے بعد پہنچتے ہیں کہ ان ان مسائل پر ہماری پوزیشن یہ ہوگی یا اس کا تعلق آرڈر کے ساتھ ہے۔ آرڈر خواہ ریاست کا ہے کسی مذہبی یا سماجی ادارے کا ہے وہ رویّوں کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ بھی ایک بڑا اہم سوال ہے کہ ہمارے رویّے کس نوعیت کے ہیں جہاں پر پاکستان کے اندر 91 فیصد شریعت بھی چاہتے ہیں۔ 59 فیصد اپنی شناخت بطور مسلمان بھی بتاتے ہیں۔ یہی سروے یہ بھی بتاتے ہیں کہ پاکستان میں سماجی جارحیت خواہ اس کا تعلق ہماری مذہبی زندگی سے ہے یا سماجی زندگی ہے اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مذہبی بیانیہ یا جواز ضرور شامل ہوتا ہے۔

یہ وائرس ہمارے رویّوں میں کہاں سے آیا اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ عدم برداشت کو ماپنے کے معیارات باہر شاید کچھ ہوں لیکن وہ ہمیں ان معیارات پر ماپتے ہیں کہ ہمارا تعلق اقلیتوں اور غیر مسلمانوں کے ساتھ کیسا ہے۔ یہ ایک بنیادی پیمانہ ہے کسی بھی ملک کی برداشت کو ماپنے کا کہ وہ کتنی برداشت رکھتا ہے اور اپنی اقلیتوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا ہے۔

پاکستان کے اندر یہاں پر 58 فیصد عیسائی جن کا تعلق روزمرہ کے امور میں مسلمانوں کے ساتھ ہے ان کی شکایت یہ ہے کہ ان کے ساتھ غیر مساوی سلوک کیا جاتا ہے۔ 22 فیصد ہندوؤں کا بھی یہ خیال ہے جبکہ پاکستان کے اندر 78 فیصد ہندو ایسے ہیں جن کا مسلمان کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے رویّوں کا اظہار یہیں تک نہیں بلکہ اس کی فرقہ وارانہ تقسیم بہت گہری ہوتی جارہی ہے۔ ایک سروے کے مطابق 20 فیصد پاکستانی شیعہ کی تکفیر کے قائل ہیں۔ یہ تعداد 14 فیصد سے شروع ہوئی تھی اور یہ مسلسل بڑھتی جارہی ہے۔ یہ کیسی اکثریت ہے جو اقلیت سے ڈرتی ہے۔ جو تقسیم در تقسیم ہوئے جارہی ہے۔ اپنے اندر اقلیتیں پیدا کئے جارہی ہے۔ یہ بڑا

اہم سوال ہے جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔سماجی رویّوں اور قوانین کے حوالے سے بھی بہت قدامت پرستانہ رجحان ہے۔اس پر ہم نہیں جاتے لیکن آپ کا تعلق جامعات سے ہے کیا آپ کے علم کے اندر ہے کہ پاکستان کے اندر کتنے فیصد لوگ زندگی میں لائبریری گئے ہیں۔ یہ جو20 کروڑ عوام ہیں ان میں سے 85 فیصد نے آج تک کسی لائبریری کا رخ نہیں کیا۔زندگی میں ایک مرتبہ لائبریری جانے والے 13 فیصد ہیں اور پاکستان کے اندر صرف دو فیصد ایسے لوگ ہیں جن کو چند مرتبہ لائبریری کے اندر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔

میں صرف ایک اور سوال آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔پاکستان اقوام متحدہ کا فعال ترین رکن ہے۔پاکستان ان ممالک میں ہے جس نے اقوام متحدہ کے تمام چارٹرز پر دستخط کر رکھے ہیں۔خواہ وہ انسانی حقوق کا چارٹر ہو،جنیوا کنونشن ہو،یا پھر نسلی ولسانی،صنفی اور مذہبی امتیازات کو ختم کرنے کے معاہدے ہوں پاکستان نے عالمی برادری کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ ان قوانین کو پوری طرح نافذ کیا جائے گا اور ان امتیازات کو ختم کیا جائے گا اور اگر کوئی رکاوٹ ہمارے آئین قانون کے اندر ہے تو اس کو دور کیا جائے گا۔اگر آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا سماج جس تشکیلی دور سے گزر رہا ہے اس کا امیج جو ہم بنا رہے ہیں کیا ہم اس سے مطمئن ہیں۔تو کیا پاکستان کو ان عالمی معاہدوں سے الگ ہو جانا چاہیے یہ میرا آپ سے سوال ہے اور کیا ان معاہدوں سے الگ ہونے کی قیمت دینے کیلئے ہم تیار ہیں۔یہ میرے چند سوالات ہیں اگر آپ کے پاس ان کے جوابات ہیں تو وہ ضرور شیئر کریں۔

سوالات وآراء:

سوال: لائبریری نہ جانے کے رجحان کی بڑی وجہ ہمارا نصاب اور طرز تعلیم بھی ہے جس میں صرف مرتب کردہ کتابوں سے ہی سوال آتے ہیں۔اس لئے طلباء دیگر کتابیں نہیں پڑھتے۔

سوال: یہ سروے صرف ہمارے بارے میں ہی کیوں آتے ہیں یہ انڈیا کے بارے میں کیوں نہیں آتے جہاں اقلیتوں کی صورتحال زیادہ خراب ہے۔

سوال: کیا مذہبی عدم برداشت کا تعلق مذہبی عدم آگاہی سے بھی ہے۔یونیورسٹیوں میں سائنسز

سے وابستہ طلباء کا مذہب کے بارے میں علم بہت واجبی ہوتا ہے۔

سوال: جہاں تک شناخت کا تعلق ہے یہ بات مشرف کے دور میں آئی جنہوں نے ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ دیا لیکن جب فرقہ واریت کی بات کی جاتی ہے تو ہم خود کو پہلے مسلمان کہتے ہیں۔اس لئے ہماری شناخت کیا ہونی چاہیے کیا پہلے ہم مسلمان ہیں یا پاکستانی ہیں؟

بہت سارے رویّوں کا تعلق مذہب کے ساتھ ساتھ ریاست کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ریاست کا جو بیانیہ ہوتا ہے وہی لوگوں کا ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے بادشاہ کے دین پر ہوتے ہیں اس طرح یہاں پاکستان کی یونیورسٹیوں کے لوگ بیٹھے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی شیعہ نہیں ہے۔

سوال: عامر رانا صاحب نے جو کہا کہ یہاں 91 فیصد لوگ نفاذ شریعت چاہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا نظام چل نہیں رہا اور جب ہمارے دانشور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام مکمل نظام حیات ہے۔اس کا نظام معیشت ہے اسی کا نظام سیاست ہے تو پھر لوگ کیوں نہیں سوچیں گے کہ ان کے مسائل کے حل کیلئے شریعت نافذ کی جائے۔

سوال: ہمارے ہاں مساجد کے امام صاحبان کیلئے باقاعدہ کوئی طریق کار نہیں ہے۔اگر کوئی طریق کار وضع کر دیا جائے تو صورتحال بہتر ہو سکتی ہے۔

سوال: ہم جن امام صاحبان سے توقع رکھتے ہیں ان کو معاشرہ دیتا کیا ہے ان کو کتنی تنخواہ یا مراعات ملتی ہیں۔

سوال: توہین رسالت کے قانون کا اگر غلط استعمال ہو رہا ہے تو اس کے ذمہ دار علماء ہیں یا ریاست کے ادارے؟

سوال: یہاں بات کی گئی کہ 91 فیصد نفاذ شریعت چاہتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ میں بھی ان میں سے ایک ہوں لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ نفاذ شریعت سے راتوں رات مسائل حل نہیں ہو جائیں گے۔رسول پاک ﷺ کو بھی لوگوں کو ذہن بدلنے میں 23 سال کا عرصہ لگا تھا۔اسی طرح قومی بیانیے کی بات کی گئی۔جب ہمارے نصاب کو ورلڈ بنک اور دیگر عالمی

ادارے فنڈز فراہم کریں گے تو پھر ہمارا قومی بیانیہ بھی وہی تشکیل دیں گے۔

سوال: اقلیتی لوگ جب اپنی حد سے تجاوز کرتے ہیں تو مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

سوال: باقی اقلیتوں کے مقابلے پر قادیانیوں کا مسئلہ مختلف ہے۔عمار خان ناصر نے جو نکات اٹھائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے اگر ایک صوبے کا گورنر ایک گستاخ کو ساتھ بٹھا کر پریس کانفرنس کرے گا تو پھر ردعمل آئے گا۔

جن امور پر تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہے ان پر حکومت نے کیا کیا ہے۔موسیقی تمام مکاتب فکر کے نزدیک حرام ہے مگر کیا تعلیمی اداروں میں بڑے بڑے موسیقی کے پروگرام نہیں ہوتے۔

سوال: عمار خان ناصر نے کہا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم کہنا ایک سیاسی فیصلہ تھا یہ تاریخی حقیقت سے انحراف ہے۔میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مستقبل میں اگر کوئی پارلیمنٹ آکر قادیانیوں کو دوبارہ مسلمان قرار دے دے تو آپ کا کیا مئوقف ہوگا؟

سوال: رانا صاحب نے فکر انگیز سوالات اٹھائے۔ہمیں اقلیتوں کا خیال رکھنا چاہیے مگر جہاں تک شیعوں کی تکفیر کا مسئلہ ہے تو کسی بھی جید عالم نے ابھی تک شیعوں کی تکفیر کا فتویٰ نہیں دیا۔

سوال: عمار خان ناصر نے کہا کہ قادیانیوں کو اگر کسی عہدے پر فائز کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔سوال یہ ہے کہ کیا قادیانیوں کو جو نوکریاں دی جارہی ہیں وہ اقلیتوں کے کوٹے سے دی جارہی ہیں۔دوسرا یہ کہ جو قادیانی ہیں وہ اپنے عقیدے کا برملا اظہار کیوں نہیں کرتے۔

جوابات:

محمد عامر رانا:

ہماری خواہش تھی کہ اس ورکشاپ میں مسلکی تنوع ہوتا۔ہم نے جامعات کے شعبہ اسلامیات کے چیئرمینوں کو خطوط لکھے کہ وہ اپنے شعبوں سے نامزدگیاں بھجوائیں۔ہماری کراچی اور خیبر پی کے، کی ورکشاپ میں یہ تنوع موجود تھا۔دوسرا یہ کہ ہم نے کشمیر اور عالم اسلام کے مسائل پر پاکستان میں پاکستان سے باہر بھی عالمی کانفرنسیں کرائیں۔عرب ممالک کے دانشوروں اور

اساتذہ کے ساتھ بھی ہمارے رابطے ہیں۔آپ کے ساتھ بھی ہمارا رابطہ ہوا۔ایک دوسرے کو سنا جاتا ہے۔میں نے جو سوالات اٹھائے آپ کی طرف سے ان کے جوابات آئے ہمارا مقصود یہی تھا۔

صرف ایک اور سوال میں اٹھانا چاہتا ہوں۔پیو کا ایک سروے ہے جس میں مغرب میں رہنے والے مسلمانوں سے پوچھا گیا کہ آپ کا اکثریت کے بارے میں کیا تصور ہے، چھ خوبیاں بتائیں اور چھ خامیاں بتائیں تو جو چھ منفی چیزیں سامنے آئیں ان کا سکور سب سے زیادہ تھا اور جب غیر مسلموں سے مسلمانوں کے بارے میں یہی سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ان کے تین رویّے مثبت ہیں اور تین رویّے منفی ہیں۔اس رویّے کا جواب بھی میں آپ سے چاہتا ہوں۔

عمار خان ناصر:

ایک سوال آیا کہ کیا عدم برداشت مذہبی نتیجہ ہے یا مذہب سے ناواقف ہونے کا نتیجہ ہے۔اس کے تین اسباب ہیں،ایک طرف مذہبی فکر کی تعبیر ایسی ہے جو ہماری موجودہ صورتحال کے بعض مسلمات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اور اس کے خلاف ردعمل تجویز کرتی ہے تو اس سے عدم برداشت جنم لیتی ہے۔دوسری وجہ انسانی کمزوری ہے کہ وہ لالچ اور بددیانتی کے تحت ایسا کرتا ہے۔تیسری چیز مذہب سے ناواقفیت ہے۔

ایک سوال آیا کہ ہمارے آئین میں تضادات ہیں۔آئین میں شریعت کی بات کی گئی ہے اور انسانی حقوق کی بات بھی ہے۔شریعت کے کئی امور ایسے ہیں جو انسانی حقوق سے متصادم ہیں۔انسانی حقوق کا جو تصور دنیا میں ہے وہ ہمارے لئے کتنا قابل قبول ہے۔اس پر بات ہونی چاہیے۔

میں نے قادیانیوں کی تکفیر میں علماء کے کردار کی نفی نہیں کی۔میں نے کہا کہ علماء کی ہی کوششوں سے ایک قومی اتفاق رائے پیدا ہوا اور آئینی سطح پر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ان کو مسلمانوں کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔میں نے جو بات عرض کی تھی وہ یہ کہ جب ہم نے ان کا آئینی سٹیٹس متعین کر دیا کہ وہ غیر مسلم ہیں اس کے بعد ان کو جو حق قانونی طور پر حاصل ہیں اس پر اعتراض نہ کریں۔اس کے بعد ہم قادیانیوں کو اہم عہدوں سے ہٹانے کے مطالبے کیسے کر سکتے ہیں۔

سوال آیا کہ دورِ جدید کے مسلمات مذہبی طور پر کتنے قابل قبول ہیں اور کتنے قابل قبول نہیں ۔ یہ اہم سوال ہے ایک تو وہ چیزیں ہیں جو مسلّم ہیں اور شریعت میں بالکل واضح ہیں ۔ اس پر ہمیں سٹینڈ لینا چاہیے ۔ میں نے یہ بات کی تھی مذہبی فکر دورِ جدید کے مسلّمات کے ساتھ رعایت نہیں کرتی ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو اجتہادی نوعیت کی ہیں اور جن کو مذہبی فکر نے آج قبول کر لیا ہے ۔

ڈاکٹر خالد مسعود

حدود آرڈیننس کے بارے میں جب علماء سے بات ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ علماء نے یہ آرڈیننس نہیں پڑھا اس میں لکھا ہوا ہے کہ جب کسی کو سنگسار کیا جائے گا اور لوگ پتھر مارنا شروع کریں گے تو ساتھ ہی گولی ماری جائے گی اور جب گولی لگ جائے گی تو اس وقت پتھر مارنے بند کر دیئے جائیں اس پر میں نے کسی عالم سے اعتراض نہیں سنا۔

آج کی گفتگو میں دو چیزیں بہت اہم سامنے آئیں ۔ ایک تو یہ کہ جب ہم عام طور پر بات کرتے ہیں تو ہم عصر حاضر کو نظر انداز کرتے ہیں کہ ہم ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جس کے اپنے عالمی قوانین ہیں ۔ جن میں ہم جکڑے ہوئے ہیں ہم ان حقائق سے انکار نہیں کر سکتے اس لئے جدید ریاست کے اندر رہتے ہوئے ہمیں بات کرنا ہوگی ۔ اس طرح یہاں شریعت کے نفاذ کی بات کی جاتی ہے جب میں اسلامی نظریاتی کونسل کا چیئرمین بنا تو 1997ء میں پاکستان کے آئین کا ایک ریویو کیا گیا جس میں سامنے آیا کہ 95 فیصد آئین پر کوئی اعتراض نہیں ہے ۔ وہ قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہے ۔ باقی 5 فیصد پر اسلامی نظریاتی کونسل نے تجاویز دی ہیں مگر ان پر بحث نہیں ہوتی اور انہیں پارلیمنٹ میں جانے ہی نہیں دیا جاتا۔

دوسرا یہ کہ ہمیں اپنے طرز تدریس پر خود نظر ثانی کرنی چاہیے ۔ ہم طلباء کو تقلیدی سوچ دے رہے ہیں کہ اس پر عمل کریں اس کے آگے پیچھے نہ جائیں ۔ ہم طلباء کو ایسی تربیت دیں کہ وہ ان مسائل پر علمی طور پر بات کر سکیں جب ہم علمی طور پر بات نہیں کرتے تو پھر ہم جذباتی احتجاج کرتے ہیں اس کی وجہ سے مسائل حل نہیں ہوتے ۔

محمد عامر رانا:

ایک اور سوال مجھے آپ کے سامنے رکھنا ہے کہ 90 فیصد پاکستانی جو نفاذ شریعت چاہتے ہیں اس میں سے 83 فیصد پاکستانی شریعت کو نظام انصاف سمجھتے ہیں یا اس کا متبادل سمجھتے ہیں ۔ کیا ریاست نظام انصاف کا ایسا نظام قائم کرے جو مذہبی بنیادیں نہ رکھتا ہو ۔ تو کیا اس سے یہ رائے بدل سکتی ہے ۔ اس کی نوعیت کیا ہوگی اور علمائے کرام کا اس پر ردعمل کیا ہوگا۔

دوسری نشست: مذہبی عدم رواداری اور عمومی رویّوں کا بگاڑ

صدارت: خورشید ندیم

مقررین: رومانہ بشیر، وسعت اللہ خان، جینی جینیفر

عنوان: مذہبی عدم رواداری اور پاکستان میں غیر مسلم

مقرر: رومانہ بشیر

قائداعظم نے اپنی 11 اگست کی تقریر میں ریاست کیلئے جو گائیڈ لائن دی اور کہا کہ یہاں بسنے والا ہر انسان برابر کا پاکستانی ہوگا ۔ اس کی مذہبی شناخت کا تعلق امور مملکت سے نہیں ہوگا بلکہ سب لوگ برابر کے شہری ہوں گے ۔ یہ تصور بانی پاکستان نے دیا کہ یہاں بین المذاہب ہم آہنگی ہوگی ۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا ۔ 1949ء میں ہمیں یہ بتایا گیا قرارداد مقاصد کی رو سے ملک کا ہر قانون اسلام کی روشنی کے مطابق ہوگا اور ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہے ۔ اس وقت غیر مسلم اراکین پارلیمنٹ نے احتجاج کیا اور کہا کہ اس سے قومی وحدت کو نقصان ہوگا ۔ جس کا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں قومی شناختیں ختم ہو کر رہ گئی ہیں ۔ اس ساری صورتحال میں اقلیتیں از حد متاثر ہوئی ہیں یہاں دو افراد کی لڑائی کو بھی مذہبی رنگ دے دیا جاتا ہے ۔ یہاں تعلیم میں بھی مسلمان اور غیر مسلمان کی تفریق ہے ۔ ہمارے نصاب میں نفرت انگیز مواد ہے ۔ غیر مسلمانوں سے نفرت سکھائی جاتی ہے ۔ استاد بھی اپنی جماعت میں غیر مسلم بچوں کے ساتھ مساوی رویہ رکھتے ہیں ۔ اس کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں ۔ اس طرح بچوں کو مساوی طریقے میسر ہونے چاہئیں ۔ بعض سماجی رویّے بھی بہت تکلیف میں ہم لوگوں کے پیشے کی بنیاد پر ان کے نام رکھتے ہیں ۔ اس

لئے غیرمسلموں کو بھی ایسے رویّوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ہمیں کافر قرار دیا جاتا ہے بعض اوقات کلاس میں بھی استاد بچوں کے سامنے غیر مسلموں کیلئے کافر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح 295-C کا پنجاب میں بہت جگہ غلط استعمال ہوا۔ یہاں دو افراد کا جھگڑا ہوتا ہے۔ ایک کے پاس جب دلیل نہیں ہوتی تو امام مسجد کے سامنے جا کر غلط بیانی کرتا ہے پھر مسجد سے اعلان ہوتا ہے اور بستی کی بستی جلا دی جاتی ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کی جبری تبدیلی مذہب اور جبری شادیاں حساس مسئلہ ہے۔

خصوصاً سندھ میں ہندوؤں اور پنجاب میں مسیحوں کے ساتھ یہ مسئلہ ہے۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ پاکستان مسلمانوں کا نہیں بلکہ پاکستانیوں کا ہے یہاں جو تفریق موجود ہے اس کو ختم کیا جائے۔

عنوان: آئین پاکستان اور کمزور طبقات کا تحفظ

مقرر: جینی فرجگ جیون

استاد معاشرے کی ذہن سازی کرتا ہے۔ جتنی زیادہ آپ خدا سے محبت کرتے ہیں اتنی زیادہ اس کے انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ ہم حقوق العباد اپنے اپنے مذاہب سے لیتے ہیں لیکن اکثر ہم میں جو منفی پن ہوتا ہے اس کو ہم مذہبی رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں وہاں سے تفریق شروع ہوتی ہے۔ پنجاب کو پاکستان کا دل کہا جاتا ہے اور یہ دل پاکستان کا حصہ ایک عیسائی کے ووٹ سے بنا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے۔ پہلی بار اس شخصیت ایس پی سنگا کے نام پر اس سال دس روپے کا ٹکٹ شائع کیا گیا۔ 1948ء کی پاک بھارت جنگ میں ایئرفورس کا پہلا شہید بھی ایک مسیحی تھا۔ استاد کا کام صرف تعلیم دینا نہیں بلکہ جوڑنا بھی ہے۔ آرٹیکل 36 اقلیتوں کے حقوق کی تحفظ کی ضمانت دیتا ہے مگر جب پاکستان بنا تھا تو قومی اسمبلی میں بہت کم سیٹیں تھیں جنہیں بعد میں بڑھا دیا گیا۔ آئین میں اقلیتوں کو جو حقوق دیئے گئے ان کا خیال نہیں رکھا جاتا، آئین کا آرٹیکل 22 کہتا ہے کہ تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم پانے والے کسی شخص کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے یا کسی مذہبی تقریب میں حصہ لینے یا مذہبی عبادت میں شرکت پر مجبور نہیں کیا جائے گا اگر ایسی تعلیم، تقریب یا

عبادت کا تعلق اس کے اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب سے ہو۔

مگر آئین جو حق دیتا ہے اس سے تعلیمی اداروں میں انحراف کیا جا رہا ہے پاکستان میں پنجاب کی شمولیت ایک غیر مسلم کے ووٹ سے ہوئی۔ پاکستان کیلئے پہلا خون ایک غیر مسلم کا بہا مگر پھر بھی کوئی غیر مسلم پاکستان کا وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔

عنوان: عدم برداشت، شدت پسندی اور میڈیا کا کردار

مقرر: وسعت اللہ خان

جب میں جینیفر کی باتیں سن رہا تھا تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ باتیں مری کی بجائے دلی میں ہوتیں اور یہ سارے کے سارے حاضرین ہندو ہوتے اور یہ چار لوگ مسلمان ہوتے تو ہم بھی اسی طرح آئین کا حوالہ دے رہے ہوتے کہ آئین ہمیں یہ حقوق دیتا ہے اور ہم وہاں کہہ رہے ہوتے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا نہیں بلکہ ایک سیکولر ملک ہے ہم چونکہ یہاں بیٹھے ہیں تو یہ سوچتے ہیں کہ پاکستان کا مستقبل نہ لبرل ازم میں ہے نہ سیکولرازم میں ہے بلکہ اسلامی نظام میں ہے۔ اس لئے صرف اس پروگرام کی جگہ بدل کے دیکھ کر سوچیں کہ ایسا ہوتا تو کیسا ہوتا۔

ہمیں بچپن سے بتایا گیا کہ دنیا میں دو نظریاتی ریاستیں ہیں ایک پاکستان اور دوسرا اسرائیل جن کی بنیاد مذہب پر ہے مگر انہوں نے کھل کر کہہ دیا کہ یہ یہودیوں کا ملک ہے۔ اگر فلسطینیوں کو رہنا ہے تو بی کلاس شہری کے طور پر رہنا ہوگا۔ انہوں نے کوئی منافقت روا نہیں رکھی جنوبی افریقہ میں جو یہودی رہتا ہے، روس میں جو رہتا ہے یا دنیا کے کسی بھی کونے میں جو یہودی رہتا ہو جب چاہے اسرائیل میں آ کر بس سکتا ہے۔ انہوں نے اس کو آئینی تحفظ دیا۔ ہم کون ہیں، ہم نے دو قومی نظریے پر یہ ملک حاصل کیا۔ یہ صحیح تھا یا غلط اب وقت گزر چکا ہے لیکن ہماری درسی کتابوں میں یہی پڑھایا جاتا ہے کہ یہ ملک مسلمانوں کیلئے حاصل کیا گیا یعنی جو آج شام پانچ بجے تک آ گیا صرف ان کیلئے اور جو بعد میں آنا چاہئیں ان کیلئے نہیں۔ یا تو آپ یہ کہیں کہ یہ کچھ مسلمانوں کیلئے حاصل کیا گیا جگہ کم ہے اس لئے ہم زیادہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ تو یہ بھی نہیں کہہ رہے نہ ہی اسرائیل کی طرح یہ کہہ رہے ہیں کہ جو بھی مسلمان ہیں وہ یہاں آ کر بس سکتے ہیں۔ یہ ہے ہمارے

دوقومی نظریے کی حقیقت۔ یہ باتیں میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ سب چیزیں پڑھ کر میں صحافی بنا، میں نے جھوٹ سنا اور منافقت کھائی۔ مجھے درسی کتابوں میں بتایا گیا کہ کشمیر کی پہلی جنگ میں یہاں سے مجاہدین گئے تھے یہ نہیں بتایا جاتا کہ وہاں سے مجاہدین پیچھے کیسے دھکیلے گئے۔ کیوں دھکیلے گئے۔ یہ ہمیں غیر درسی کتابوں سے پتہ نہیں چلے گا۔

درسی کتابوں کے مطابق 1955 کی جنگ ہم نے جیتی، بزدل دشمن نے رات کے اندھیرے میں حملہ کیا اور ہم نے اسے پسپا کیا۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ دشمن نے حملہ کیا اور ہم نے اسے آگے نہیں بڑھنے دیا لیکن وجہ کیا تھی، کیا دشمن پاگل ہو گیا تھا یا اچانک اس پر حملہ کرنے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ 6 ستمبر سے پہلے جو کچھ ہوا تھا اس کا بھی ہمیں معلوم ہے، ہاں معلوم ہے مگر ہم میں اتنی جرأت نہیں کہ کلاس میں بتاسکیں۔

کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کی نوعیت سفارشی ہے۔ یہ چیپٹر 6 کے تحت منظور ہوئی یعنی مانی جائیں تو ٹھیک ہے نہ مانیں تو بھی کوئی زور نہیں چلتا جبکہ آرٹیکل 7 کے تحت منظور ہونے والی قراردادیں لازمی ہوتی ہیں لیکن ہم یہ اپنی درسی کتابوں میں نہیں پڑھاتے۔ صحافیوں اور اساتذہ میں ایک اور قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں ہی نہیں پڑھتے۔ مجھے 36 سال صحافت میں ہو گئے، میں نے کچھ رپورٹنگ بھی کی ہوگی، کچھ پڑھا بھی ہوگا مگر اس میڈیا میں جو ذہن ساز لوگ ہیں وہ پیراشوٹ سے اترے ہیں انہیں صحافت کے اصولوں کا نہیں معلوم۔ انہیں صرف ریٹنگ سے غرض ہے۔ چاہے اس کیلئے خون ہی نہ بہہ جائے، مذہب فروشی کے ذریعے یا اینکر کو ممتاز عالم دین قرار دے کر بس ریٹنگ آنی چاہیے۔ آپ دیکھ لیں خورشید ندیم سے زیادہ پڑھی لکھی باتیں کون کر سکتا ہے مگر ریٹنگ عامر لیاقت کی ہی آتی ہے۔ جس روز میں نے پڑھنا شروع کر دیا آپ نے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس دن اگلی نسل بھی پڑھنا شروع کر دے گی۔

سوالات و آراء:

☆ رومانہ بشیر صاحبہ کے خیالات کی روشنی میں کئی ایسی باتیں سامنے آئیں جن پر ہمیں اپنی سوچیں بدلنے کی ضرورت ہے۔ رومانہ بشیر صاحبہ سے عرض ہے کہ یہ سلوک صرف اقلیتوں

سے نہیں بلکہ مسلمان معاشرے کے اندر بھی یہی صورتحال ہے۔ مسالک اور نسلی گروہوں کو بھی ایسے ہی القابات سے نوازا جاتا ہے۔

سوال: محترمہ نے حافظ قرآن بچوں کو 20 نمبر دینے کی بات کی تو اس سے اقلیتوں کے بچے ہی نہیں بلکہ 95 فیصد مسلمان بچے بھی متاثر ہوتے ہیں۔

سوال: میں رومانہ بشیر سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر پاکستان ابتدا میں ایک اسلامی ریاست نہیں تھی۔ پھر پاکستان بنانے کی ضرورت کیا تھی۔

سوال: وسعت اللہ خان صاحب نے کہا کہ تمام مسائل کا حل پڑھنے لکھنے میں ہیں۔ میرا ان سے سوال ہے کہ کیا پڑھا جائے؟

سوال: میرا سوال محترمہ رومانہ بشیر اور جینیفر سے ہے کہ کیا مسلمان جس طرح حضرت عیسیٰ کے بارے میں عقیدت رکھتے ہیں آپ کی سوچ اس لحاظ سے ہمارے پیغمبر کے بارے میں کتنی مساوی ہے۔ ہمارے ایمان میں ہے کہ اگر ہم حضرت عیسیٰ یا حضرت مریم کی شان میں گستاخی کریں تو ہمارا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔

سوال: جیسے واقعات کا اظہار رومانہ بشیر نے کیا ویسے ہی واقعات مسلمانوں کے ساتھ بھی یہاں ہو رہے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اگر آپ کی کوئی بچی اپنی مرضی سے مسلمان ہوتی ہے تو اس کے ساتھ آپ کا رویہ کیسا ہوتا ہے؟

ڈاکٹر راغب نعیمی:

رومانہ بشیر نے جبری شادیوں کے حوالے سے بات کی، میرا تعلق ایک دینی ادارے سے ہے، اس حیثیت سے میرے پاس جب لوگ مسلمان ہونے کیلئے آتے ہیں تو بحیثیت مسلمان ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ اگر اس کے پاس سرٹیفکیٹ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کر رہا ہے تو ہم اس شخص کو دائرہ اسلام میں داخل کرتے ہیں۔ ہمارے ادارے کے اندر سالانہ چار سے پانچ سو لوگ مسلمان ہوتے ہیں۔ کہیں پر بھی جبر نہیں ہے۔

رومانہ بشیر:

میں نے اپنی تقریر میں خود کہا کہ بہت سارے مسلمان بچے بھی حافظ قرآن نہیں ہوتے انہیں بھی 20 نمبر نہیں ملتے۔نظریہ پاکستان اور اسلامی ریاست کا سوال یہاں آیا تو میں یہی کہوں گی کہ یہ جدوجہد اقلیتوں کی اکثریت کے خلاف تھی۔مسلمانوں کے ساتھ دیگر اقلیتیں بھی ان کے ساتھ شامل ہوئیں۔ہم سب کو قائداعظم کی 11 اگست والی تقریر ضرور پڑھنی چاہیے کیونکہ یہی مستقبل کے پاکستان کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

یہاں یہ سوال بھی کیا گیا جولڑکیاں مذہب تبدیل کرتی ہیں ان کے ساتھ آپ کا رویہ کیسا ہوتا ہے۔میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ وہاں بھی عدم برداشت کا ہوتا ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہی لڑکیاں وہاں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتیں اور واپس آجاتی ہیں۔میں نے ان کا ایشو نہیں اٹھایا بلکہ ان کا اٹھایا جو اغوا ہوتی ہیں۔

یہاں بات کی گئی انبیائے کرام کے احترام کی۔میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہر مذہب انبیاء سے احترام کی بات کرتا ہے۔

ایک مسیحی کا ایمان ہے کہ یسوع مسیح خدا کا بیٹا ہے جبکہ ایک مسلمان کا ایمان ہے کہ وہ خدا کا بیٹا نہیں پیغمبر ہے۔یہ وہ سوال ہے جس کو ہم تبدیل نہیں کر سکتے۔اگر آپ دوسرے کے ایمان کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھیں گے تو وہ آپ کو ٹھیک نہیں لگے گا۔

جینی فرجگ جیون:

جب ہم اقلیتوں کی بات کرتے ہیں تو ہماری نظر صرف پاکستان پر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا پر ہوتی ہے۔روانڈا میں عیسائیوں کے اندر جولڑائی ہوئی اس میں صرف ایک ہفتے کے دوران کئی لاکھ لوگ مارے گئے تھے۔پاکستان انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کا دستخط کنندہ ہے جہاں مذہب تبدیل کرنے کی آزادی ہے۔یہاں وزیراعظم کے عہدے کی بات ہوئی میں سمجھتی ہوں یہ عہدہ بلا لحاظ مذہب ہر اس کو ملنا چاہیے جو اس کا حق دار ہو۔میں اس وقت بہت خوش ہوئی جب صادق خان کو لندن کا میئر بنایا گیا۔

خورشید ندیم:

اس بحث کا مطلب یہ تھا کہ ہم نقطہ ہائے نظر کے اختلاف کو جانیں اور سمجھیں۔یہ مقصد تو ہم نے حاصل کیا کہ ہم نے ایک دوسرے کو محبت اور برداشت کے ساتھ سنا۔دوسری چیز یہاں جو سوالات ابھرے ان کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ ایک قومی ریاست اور اسلامی ریاست میں کیا فرق ہوتا ہے۔پاکستان ایک قومی ریاست ہے یا اسلامی ریاست ہے۔اگر پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے تو لازماً یہ اسلام کو ماننے اور نہ ماننے والوں میں فرق روا رکھے گی۔ہمارے لوگوں نے قومی اور اسلامی ریاست کے تصور کو باہم مدغم کر دیا جس سے معلوم نہیں ہو سکا کہ ریاست کو کیسے چلنا ہے۔اس وجہ سے تضادات سامنے آئے۔تیسری بات یہاں پر یہ سامنے آئی کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اسلام سے منسلک نہیں کرنا چاہیے یہ مسلمانوں کے رویّے ہیں۔میرا آخری سوال یہی ہے کہ مسلمانوں کو اسلام کون سکھائے گا۔

آخری نشست

تجاویز وآراء

صدارت: ڈاکٹر ڈاکٹر قبلہ ایاز

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

معاشرے میں تنوع نہ ہو تو اس میں تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔نئے علوم کا راستہ رک جاتا ہے۔اس آخری سیشن میں ہم اپنی گفتگو کا حاصل بیان کریں گے کہ کس طرح ہم آگے لے جا سکیں گے اور اساتذہ کرام کا وہ کردار سامنے آئے گا جو پاکستان کے حالات کا تقاضا ہے۔

رائے:

میں تو اپنے طلباء کو یہی کہوں گی کہ دنیا کے تمام مذاہب اخلاقیات کی تعلیم دیتے ہیں۔ہمسائے کے حقوق کی بات کرتے ہیں اپنی ذات کی نفی کریں۔یعنی ذاتی مفاد کی بجائے اجتماعی مفاد کو ملحوظ خاطر رکھیں۔

ڈاکٹر طاہر محمود:

اگر میری کلاس میں طلباء ہوں تو میں ان سے اس طرح سے بات کروں گا۔

عزیز طلباء!

آج کے لیکچر کا موضوع ہے، دنیا میں امن کا فروغ۔

یہ ایسا سوال ہے جو تمام ادیان، مسالک اور مذہب کی ایک مشترکہ ضرورت ہے، اس سوال کو ہم نے تاریخ کے تناظر میں سمجھنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ہم اپنے اپنے معاشروں میں امن کے فروغ کیلئے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں چونکہ ایک مسلمان استاد کی حیثیت سے آپ سے مخاطب ہوں اس لئے میں چند نکات آپ کے سامنے رکھوں گا۔ اگر آپ کو محسوس ہو کہ کوئی نقطہ آپ کے مذہب یا عقیدے کے خلاف ہے تو مجھے آگاہ کریں۔

امن عالم انسانیت کی وہ مشترکہ ضرورت ہے کہ ابتدائے انسانیت سے لے کر آج تک ہر انسان اس کا متلاشی ہے۔ امن کا تعلق کسی خاص مذہب یا مسلک سے جوڑنا درست نہیں۔ دوسری بات دنیا میں سارے مذاہب نے آج تک امن کی بات کی۔ امن کیسے فروغ پاتا ہے اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سرفہرست ہے۔ حقوق اللہ میں ایک معبود کی عبادت برحق، تمام آسمانی مذاہب میں یہ قدر مشترک ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالغفار بخاری:

میں اپنے طلباء سے کہوں گا کہ وہ فقہی اختلافات کو آپس میں تقسیم کی وجہ نہ بتائیں بلکہ اسے ایک حسن کے طور پر دیکھیں۔

ڈاکٹر شہباز شیخ:

عزیز طلباء و طالبات!

دنیا میں دو طرح کے انسان ہے ایک وہ جو حدودِ باری تعالیٰ کے قائل ہیں اور دوسرے وہ جو حدودِ باری تعالیٰ کے قائل نہیں ہیں۔ جو لوگ قائل ہیں ان کی زندگی کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو راضی کریں۔ اسی کلاس میں ہر ادیان کے لوگ موجود ہیں۔ ہر مذہب کا بانی یہی بات

کرتا ہے۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

وہ دانش جو ہم نے یہاں ایک علمی گفتگو سے حاصل کی ہم اس کو آگے بڑھائیں گے اس امید اور دعا کے ساتھ کہ ہمارے معاشرے میں سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کی بنیاد پر بہتر معاشرتی تشکیل ہو سکے گی۔

ڈاکٹر راغب نعیمی:

بنیادی طور پر اس ورکشاپ کا مقصد یہی تھا کہ ہم اپنی سوچ میں وسعت پیدا کریں اور مخالف نظریہ کو بھی دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا۔ آپ نے جو تجاویز دیں وہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ جن سے استفادہ کیا جائے تو ایک بہتر معاشرہ سامنے آئے گا۔

معلمین کا تعارف

ڈاکٹر خالد مسعود:

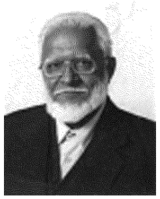

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جنرل اور ہالینڈ کے انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار دی سٹڈی آف اسلام کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔اسلام اور اسلامی دنیا کو درپیش مسائل ان کے دلچسپی کے خصوصی میدان ہیں۔اس حوالے سے مختلف اخبارات و جرائد میں بھی لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

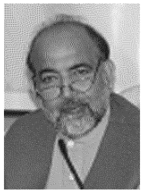

پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ 25 سے زائد بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی اور برطانیہ کی برونن یونیورسٹی میں بھی لیکچر کے لئے مدعو کئے گئے۔''ماحولیات اور اسلام'' اور'' بارودی سرنگوں کا استعمال،اسلام کے تناظر میں'' نامی کتب کے مصنف ہیں۔آپ کے متعدد علمی اور تحقیقی مقالے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر سید جعفر احمد:

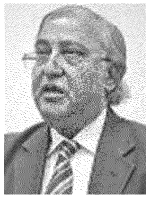

پاکستان سٹڈی سینٹر کراچی یونیورسٹی کے ڈائریکٹر ہیں۔آپ ایک کتاب Federalism in Pakistan: A Constitutional Study کے مصنف ہیں۔علاقائی اور عالمی تنازعات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔سیاسیات کے استاد ہونے کے ناطے پاکستانی معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے اثرات کا عمیق مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر خالدہ غوث:

گزشتہ تیس سال سے تعلیم و تحقیق سے منسلک ہیں۔سوشل پالیسی اینڈ ڈویلپمنٹ سینٹر کراچی کی مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔اس سے قبل خالدہ غوث کراچی یونیورسٹی کے شعبہ بین الاقوامی تعلقات کی سربراہ بھی رہی ہیں۔وفاقی اور صوبائی سطح پر پالیسی سازی میں بھی آپ شریک رہی ہیں۔پاکستانی سماج کی ساخت اور اس کے مسائل پر آپ کی گہری نظر ہے۔

خورشید احمد ندیم

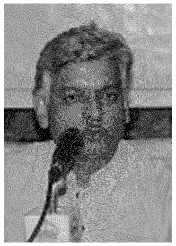

نامور کالم نگار، دانشور اور پاکستان ٹیلی ویژن میں اینکر پرسن ہیں۔کئی کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے جریدے ''اجتہاد'' اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے جریدے ''فکرونظر'' کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔علاوہ ازیں آپ حکومتِ پاکستان کے'' کمیشن فار اسلامائزیشن آف ایجوکیشن'' کے سیکرٹری بھی رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹراے ایچ نیئر:

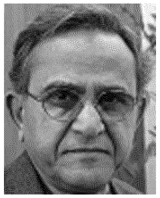

ڈاکٹر عبدالحمید نیئر کا تعلق بھی تعلیم وتدریس سے ہے۔آپ قائداعظم یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد کئی نجی اداروں سے وابستہ ہیں، کئی کتابوں اور تحقیقی مقالوں کے مصنف ہیں ۔علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر دیرپا امن کی تحریکوں کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔پاکستان میں نصاب سازی کے مسائل پر آپ کی گہری نظر ہے۔

وسعت اللہ خان:

برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی سے منسلک نامور صحافی ہیں۔اس کے علاوہ ڈان نیوز پر ایک ٹاک شو کے شریک میزبان بھی ہیں۔ان کے کالموں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ پاکستان کے سماج اور سیاست کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ پاکستانی سماج کے نباض ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

ڈاکٹر راغب حسین نعیمی:

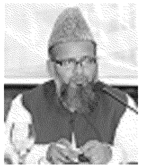

جامعہ نعیمیہ لاہور کے پرنسپل ہیں۔ڈاکٹر راغب حسین نعیمی نے پنجاب یونیورسٹی سے اسلامی معیشت میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ایک کتاب ''امن میرا حق'' کے مصنف ہیں۔پاکستانی معاشرے میں امن، برداشت اور رواداری کے فروغ کے لئے کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔آپ معروف عالم دین ڈاکٹر سرفراز نعیمی شہید کے فرزند ہیں۔

رومانہ بشیر

اقلیتوں کے حقوق، بین المذاہب ہم آہنگی، مذہبی آزادیوں اور عورتوں کے حقوق کے لئے 1995ء سے مصروف عمل ہیں۔آپ پیس اینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی ایگزیکٹوڈائریکٹر ہیں۔اس کے علاوہ حکومت پنجاب کے ذیلی ادارے ''پنجاب کمیشن آن دی سٹیٹس آف ویمن'' کی ممبر ہیں۔

عمار خان ناصر

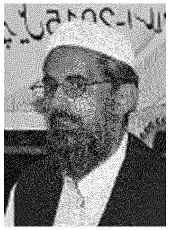

گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ میں عربی اور اسلامک اسٹڈیز کے استاد اور ماہنامہ ''الشریعہ'' کے مدیر ہیں۔نامور علمی اور مذہبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ مولانا زاہد الراشدی کے فرزند ہیں۔شہادۃ العالمیہ کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ماسٹر کر رکھا ہے اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

جینی فرجگ جیون:

کرسچین سٹڈی سینٹر کی قائمقام ڈائریکٹر ہیں۔آپ تعلیم، عقائد، انسانی حقوق اور قیامِ امن کے لئے کام کرتی ہیں۔پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کو اجاگر کرنے میں جینی فرکی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔